اسلامی فنِ تعمیر

اسلامی فنِ تعمیر

سنہ ۶۲۳ء تا سنہ ۱۶۱۵ء

چند اسباب اور علل

از

ارنسٹ ٹاڈہیام رچمنڈ، اف، آر، بی، اے

سابق اسسٹنٹ ارکیٹکٹ برائے مجلس تحفظ آثار عرب مصریہ

سابق کنسلٹنگ آرکیٹکٹ برائے ضریحِ مقدس مسیح واقع بیت المقدس

مترجمہ

سیّد مبارز الدین رفعتؔ ایم۔ اے (عثمانیہ)

پبلشر:-
انجمن ترقّی اُردُو (ہند) علی گڑھ

قیمت ۸عہ/

طباعت زیر اہتمام
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی

تعداد طبع ۱۰۰۰
(نعمانی پریس دہلی)

جنوری ۱۹۵۲ء

فہرست مضامین

خوشا مسجد و منبر و خانقاهے

کہ در وے بود قیل و قالِ محمد

صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

پہلا باب

پہلی صدی: ابتدائی نشستیں

اسلامی دنیا کی عمارتیں، اور بہت سی عمارتوں کی طرح، ایسے مقاصد کی تکمیل کے لئے تعمیر کی گئی ہیں جن کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت کی پیداوار ہیں۔ یوں اس مطمح نظر سے متاثر ہو کر ہماری دنیا کی طرح اسلامی دنیا میں بھی طریقۂ خلق ہر جگہ اور ہر زمانے میں خارجی حالات کا تابع رہا ہے۔ مقصد کی پوری تکمیل یا کمال ظہور کے لئے یہ حالات موزوں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ناموزوں بھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف مقاموں پر فن تعمیر کا علم اور اس کی مہارت مختلف مدارج پر نظر آتے ہیں، اور ان سے کام لینے کی قوت ہمیشہ تغیر پذیر سیاسی اور معاشی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ یوں انسانی ضروریات کے ان خارجی حالات سے ٹکرانے سے فن تعمیر عالم وجود میں آتا ہے، اور اس طرح ضروریات کی مسلسل نئی تعبیر اور حالات میں اتنی ہی مسلسل ترمیم سے فن تعمیر غیر مختتم طور پر تغیرات اور انقلابات سے گزرتا رہتا ہے۔ پس اگر ہم کسی قوم یا کسی مذہب کے فن تعمیر کو سمجھنا چاہتے ہوں

تو ہمیں زندگی سے اس فن تعمیر کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اس غرض کے لئے اس کے مقاصد اور ان حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے جن کے تحت وہ عالم وجود میں آیا اور مروج رہا۔ کیونکہ فن تعمیر صرف فنی مسائل کو حل کرنے کی کوشش ہی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک مبہم حسن کارانہ تمنا کے اظہار سے بھی زیادہ معنیٰ اپنے اندر رکھتا ہے۔

اسلامی فن تعمیر کا ابتدائی سبب اُس زبردست مذہبی اور سیاسی انقلاب میں مضمر ہے جو ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں پیش آیا جب کہ اسلامی فوجوں نے سلطنت روما کے بہت سے صوبوں پر قبضہ کر لیا اور دولت ایران کا خاتمہ کر دیا۔ یہ طوفانی فضا جس میں اسلامی فن تعمیر نے جنم لیا، اس کی تاریخ میں سرایت اور اس کے مزاج کو متاثر کرتی رہی۔ اور اس کے آغاز سے بعد کی تیرہ صدیاں ایسے پُر آشوب اور منقلب زمانے دیکھ چکی ہیں جیسے کہ پُر آشوب زمانے نے اس کو پیدا کیا تھا۔

عرب قوم کو اب یا ساتویں صدی میں وحشی سمجھنا ایک غلطی ہوگی۔ عرب کے جنوب مغربی گوشے میں، اس علاقے میں جو یمن کہلاتا ہے، اب بھی ایسے تمدن کے آثار باقی ہیں جو رسول عربی حضرت محمد صلعم کے ظہور سے قبل چھٹی صدی کے ربع آخر میں موجود تھا آنحضرت کی ولادت کے وقت یمن کے لوگوں میں نوشت وخواند کا رواج باقی نہ رہا تھا۔ لیکن گذشتہ تمدن کی یاد ابھی پورے عرب میں تازہ تھی۔ عربی روایات یمنی تمدن کے زوال اور لوگوں کے

منتشر ہونے کو مارب کے مقام پر ایک بڑے بند کے ٹوٹنے سے منسوب کرتی ہیں جہاں اب بھی گذشتہ زمانے کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ عرب کے شمال میں بازنطینی اور ایرانی مملکتوں سے راست اور مسلسل ربط تھا۔ اور بے شبہہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب اور شمال دونوں طرف سے ان مملکتوں سے تجارت ہوتی تھی۔ چھٹی صدی میں مکّہ ایک اہم شہر بن چکا تھا۔ اسلام کے استقلال سے بہت عرصہ پہلے ہی سے اسے ایک زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور زیارت کے ذریعہ عرب کے دوسرے قبائل سے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اس طرح ان عربوں میں، جنھوں نے بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کو زیر کیا، جاہل اور مفلس ہونے کے باوجود ایسے عناصر موجود تھے جو تمدنی اثرات سے ناواقف یا بے گانہ نہ تھے۔

اسلامی سنہ کی ابتدا ۶۲۲ء میں آنحضرت کے مکّہ سے مدینہ کو ہجرت سے ہوتی ہے۔ کہنا چاہیئے کہ اسلامی فن تعمیر کی ابتداء اسی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر سے ہوئی۔ عربی میں مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں۔ پہلی مسجد جو مدینہ میں تعمیر ہوئی تھی، ایک جامع مسجد تھی۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں مسلمان جمع ہو سکتے، نماز پڑھ سکتے اور اپنے آقا کے کلام کی سماعت کر سکتے تھے۔ مسجد مربع نقشہ پر بنائی گئی تھی۔ اور اس کا ہر ضلع ایک سو ذرع لمبا تھا[۱]۔ بنیادیں اور احاطہ کی دیوار زمین سے ساڑھے چار فیٹ تک پتھر کی تھیں۔ اس سطح سے اوپر دیواریں اینٹ کی

---

[۱] ابن ہشام ص ۳۳۷

تھیں۔ رسول اللہ صلعم امامت کرتے وقت شمالی دیوار کے قریب قیام فرماتے تھے۔ آپ کی پشت جماعت کی طرف ہوتی تھی جو صف لبستہ آپ کے پیچھے کھڑی ہوتی تھی۔ احاطہ کا، یا زیادہ اغلب یہ ہے کہ اس کا صرف شمالی حصّہ مسقف تھا۔ چھت کھجور کے تنوں پر ڈالا گیا تھا، اور اس کو سہارا دینے کے لئے اسی کے شہتیر استعمال کئے گئے تھے۔ اور ان پر کھجور کی ٹہنیاں لپیٹ دی گئی تھیں۔ قبلہ، یا وہ سمت جس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی، شمال کو منتخب کیا گیا تھا۔ کیونکہ یروشلم کا مقدس شہر شمال میں واقع ہے۔ "قبلہ" یا نماز کی سمت ایک بڑے پتھر پر مشتمل شمالی دیوار میں بنائی گئی تھی۔ 'اذان' جو دن میں پانچ مرتبہ ہوتی تھی، چھت پر سے دی جاتی تھی۔ ۶۲۴ء میں رسول اللہ صلعم نے سمت نماز کو یروشلم سے مکّہ کی طرف پھیرنے کا حکم دیا۔ یعنی شمالی سمت سے جنوبی سمت کی طرف۔ ایک گرم اور معمور شہر میں ایک عبادت گاہ کے لئے سورج سے بچاؤ اور شور و غل سے علیحدگی اولین ضروریات ہیں۔ منظم اور باجماعت نماز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سب ایک ہی سمت میں سجدہ ریز ہوں۔ اس طرح ایک سمت کے تعین کی ضرورت داعی ہوئی۔ یہی وہ ناگزیر اور تنہا ضروریات تھیں جو پہلی مسجد میں ملحوظ رکھی گئی تھیں۔

اس زمانے میں رسول اللہ صلعم کے پیرو بہت مفلس تھے۔ مکہ اور اس کے محاصل حج ابھی تک ان کے قبضے میں نہیں آئے

تھے۔ اور سایہ اور خلوت کی ابتدائی ضروریات کو ممکن اور سادہ ترین طریقہ پر اور قابل حصول اشیا کے ذریعہ پورا کرنا تھا۔ آج بھی ایک مسجد کی ضروریات اتنی ہی ہیں جتنی کہ وہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں تھیں۔ مصر اعلیٰ کے دور دست قصبوں میں دریائے نیل کی گیلی مٹی، اینٹوں کی صورت میں کچّی یا پکّی، واحد تعمیری مسالہ ہے۔ تصویر (۱) اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ناداری کے ایسے حالات میں جن کا مقابلہ مدینہ میں تعمیر شدہ اولین مسجد کے حالات سے کیا جا سکتا ہے، ایک اسلامی عبادت گاہ کی ضروریات کس طرح پوری کی جاتی ہیں۔

اولین مسجد کی تعمیر کے بعد آنحضرت کو عرب کے پورے طول و عرض میں کامیابی کے ساتھ اسلام کی اشاعت کے لئے مزید دس سال جد و جہد کرنی پڑی۔ آپ نے اپنی اس فتح کے تھوڑے ہی دنوں بعد ۶۳۲ء میں انتقال فرمایا۔

آپ کے جانشین سیدنا ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کا پہلا سال ایسے قبائل کی سرکوبی میں صرف کیا جو مرتد ہو کر عیسائی بن گئے تھے یا پھر سے بت پرستی اختیار کر رہے تھے۔ آپ نے اسلام کو ایک مذہب اور ایک فوجی قوت کی حیثیت سے استحکام بخشا۔ ایک ایسی فوجی تنظیم کی حیثیت سے جو منفعت بخش روزگار مہیا کر سکتی تھی، اسلام نے بھوکے متبعین کے دلوں کو لبھا لیا، اور ایک مذہب کی حیثیت سے ان کو نظم و ضبط عطا کیا۔ جزیرۃ العرب کے متحد ہو جانے کے بعد اس خوفناک

ہتھیار کو استعمال کرنے کے لئے بیرون عرب کے سوا اور کوئی میدان نہ تھا۔ دو راستے بیرونی دنیا کو جاتے تھے۔ ایک بازنطینی سلطنت کی شامی سرحدوں تک اور دوسرا دریائے فرات اور ایران کی سرحدوں تک جاتا تھا۔ ۶۳۳ء کے اختتام سے کچھ ادھر ہی سیدنا ابوبکرؓ نے چھاپہ مارنے اور لوٹنے کے لئے ان دونوں راستوں پر اسلامی فوجیں روانہ کیں[۱]۔ یہ فوجی نقل و حرکت، جس کی ابتداء غالباً چھاپہ مارنے ہی کی غرض سے کی گئی تھی، فتوحات کی صورت میں ختم ہوئی۔ جب فتح کی فوج آگے بڑھتی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ بے حساب خراج بھی ہاتھ آتا گیا۔ مفتوح قوموں نے نئے مذہب کو اختیار کر لینے میں بہت سی مصلحتیں دیکھیں ایسا کر کے وہ اس سماجی کمتری کی لعنت سے بچ گئے جو غیر مسلموں پر مسلط کی جاتی تھی۔ وہ ایسے محاصل سے نجات پا گئے جن کا ادا کرنا غیر مسلموں پر لازم تھا۔ وہ نئی فتوحات کے مال غنیمت میں حصہ رسد پانے لگے۔ اور جو لوگ مذہبی اعتقادات کی بنا پر اس میں داخل ہوئے تھے، ان کے لئے صرف اس دنیا ہی کی نہیں بلکہ دوسری دنیا کی جزائیں بھی موجود تھیں۔ اسی سال کے اندر اسلامی سلطنت میں شام، عراق، مصر شمالی افریقہ، اسپین، ایران، ماوراء النہر، بلوچستان، اور افغانستان شامل ہو چکے تھے۔ اور وہ ہندوستان میں دریائے سندھ سے بھی آگے پھیل چکی تھی۔ ان تمام ملکوں میں تعمیری

---

[۱] تاریخ عرب، مصنفہ ہوگارتھ ص ۵۵
A History of Arabia.
D. G. HOGARTH.

یادگاریں پائی جاتی تھیں، اور ان میں سے بہت سے ملکوں میں ترقی یافتہ صنعتیں اور معاشی خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ دو سو پچاس سالہ وسی گو تھک دور حکومت کے باوجود اسپین میں رومی فن تعمیر کے آثار موجود تھے۔ اور ایسی آبادی باقی تھی جو تعمیر کاری کا علم رکھتی تھی۔ جیسا کہ ہمیں وسی گو تھک عہد کی باقی ماندہ چند عمارتوں یا عمارتوں کے حصّوں سے پتہ چلتا ہے۔ شمالی افریقہ، رومی آثار کے علاوہ عیسائی کلیساؤں، گرجوں اور خانقاہوں سے معمور تھا۔ مصر میں بہ مقام اسکندریہ بطلیموس سو تر (PTOLEMY-I SOTER) کا تعمیر کردہ فراز (PHAKOS) یا روشنی کا مینار جو عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا ابھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ عرب مصنف اسے "منارہ" کہتے ہیں، اور یہ لفظ مصر میں اب تک مساجد کے میناروں کے لئے مستعمل ہے۔ اسکندریہ میں سڑکیں ایک باقاعدہ نقشہ کے مطابق ڈالی گئی تھیں۔ اور ان کے گرد ستون دار برآمدے تعمیر کئے گئے تھے۔ سنگ مرمر کی بہتات تھی، اور وہاں ایک ایسی منڈی تعمیر کی گئی تھی جس کا فرش اور دیواریں اسی پتھر کی تھیں۔ عرب مصنف ایسے ستون کا ذکر کرتے ہیں جو سنگ سلیمان کے اور بعض زبرجد سے مشابہ تھے۔ وہاں مخروطی مینار بھی تھے۔ جن میں قلوپطرہ کی سوئی بھی تھی جو اب لندن میں ہے۔ قیصریہ (Caesarian) جو دراصل ایک بت خانہ تھا، اور بعد میں گرجا بنا، اس سے بھی زیادہ مشہور سراپیم (SERAPEUM)، اور سمندر میں ایک چٹان پر بنا ہوا ایک دیو پیکر کانسی کا مجسمہ، یہ وہ عجائبات

تھے جن سے مسلم حملہ آوروں کی آنکھیں دوچار ہوئیں۔ علاوہ ازیں سارا ملک، نوبیا میں بہت دور دریائے نیل تک نہ صرف قدیم معبدوں سے بلکہ کلیساؤں اور خانقاہوں سے بھی پٹا پڑا تھا شام میں بھی یونانی رومی شہر اور ان میں ستون دار برآمدے والی سڑکیں موجود تھیں۔ اور ساتھ ہی تقریباً بے شمار کلیسا بھی تھے۔ ان شہروں میں بہت سے شہروں کے آثار اب تک موجود ہیں، اور ان کلیساؤں میں سے کم از کم ایک میلاد مسیح کا باسلیقی کلیسا واقع بیت اللحم اب تک استعمال ہو رہا ہے۔ اور دوسرے کلیساؤں کے کھنڈر قبل اسلام شامی فن تعمیر کی وسعت اور شان وشوکت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مسوپیٹمیا اور ایران میں حکمران ساسانی خاندان کی عمارتیں پائی جاتی تھیں۔ اور جو کچھ تیسفون، سروستان اور فیروز آباد کے محلوں کی باقیات رہ گئی ہیں ان سے ہم ساسانی مملکت کے تعمیری کمال کا تھوڑا بہت اندازہ کر سکتے ہیں۔ مفتوحہ ملکوں کی عمارتوں میں جس قسم کے خاکوں کی صورتیں اور تعمیری عناصر پائے گئے ہیں ان میں مثمن، دائرہ، نیم قوسی طاق، محراب، چھجا کھلے صحن، چھتے، اینٹ اور پتھر کی دیواریں، پائے، ستون، توڑے، قوسی لداو چھتیں، حجری، چوبی اور خشتی گنبد، کلاہ نما اور مدور گنبد کے کروی حصے، اور سپاٹ اور پختہ چوبی چھت شامل ہیں۔ ذیلی صنعتوں کا مظاہرہ استرکاری اور پچی کاری کا کام کرنے والے، پتھر اور مرمر کے فرش بند، کاشی کار، دہات کار

---

۵ قاموس الاسلام میں اسکندریہ پر گسٹ کا مضمون ARTICLE ON "ISKANDARIYA" BY A-R. GUST

روغنی ظروف ساز، چول بند، چوبی منبت کار، اور پتھر اور مرمر کے مسجمہ ساز کہتے تھے۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ جن ملکوں پر حملہ کیا گیا اور جن کو بہت بڑی حد تک مسلمان بنا لیا گیا، ان میں لوگ تعمیری صنعتوں میں اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔ اس طرح اسلام کے قبضے میں نہ صرف مفتوحہ تہذیبوں کی پیدا کردہ صحیح و سالم موجود عمارتیں اور قدرے برباد عمارتیں آئیں، بلکہ اس نے نئے مذہب کے لئے زندہ علم اور وہ مہارت بھی حاصل کر لی جس کی مفتوحہ قومیں حامل تھیں۔ اور دور ماضی سے ورثہ میں پاتی چلی آئی تھیں۔ اور یہی وہ چیزیں تھیں جو سب سے زیادہ لاقیمت اور لابدی تھیں۔ یہی وہ علم تھا اور یہی وہ مہارت تھی جو اسلام میں ضم ہو کر ایک نئے مزاج کی شکلوں میں دوبارہ ظہور پذیر ہونے والی تھی۔ اور یہ ایک ایسا فن تعمیر پیدا کرنے والے تھے جسے کبھی سراسینی (Saracenic) کبھی اسلامی، اور کبھی مسلم یا محمدی فن تعمیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فن تعمیر اسپین سے لے کر ہندوستان تک خواہ کہیں بھی پایا جائے، اور خواہ کوئی سی قوم اسے استعمال کرتی رہی ہو، اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے ــــ ایک ایسا مزاج جس کو توضیح و تشریح کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ تمیز کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمومی خصوصیت نہ صرف مختلف قوموں کے ایک مشترکہ مذہب اور ایک مشترکہ سماجی نظام کو قبول کرنے کا نتیجہ ہے بلکہ دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں فنی طریقۂ کار کے تصورات بلکہ خود صناعوں کے ان تصورات کی اشاعت کے مواقع پیدا ہونے کی رہین منت ہے۔ بے شبہ نشر و اشاعت کا یہ طریق عمل فتوحات اور قبول اسلام کا ایک فوری نتیجہ تھا۔ اور یہ بیشتر مفتوحہ قوموں کے ان

صناعوں کی بھرتی کی وجہ سے ہوا جن کے فلزی، چوبی، چرمی، اور بافتی کاموں کی اسلامی فوجوں کو اپنی جنگی تنظیم کے لئے ضرورت تھی ابتدائی فتوحات کے عہد کے بعد، حج بیت اللہ جس میں دنیائے اسلام کے ہر حصہ سے لوگ جمع ہوتے تھے، ایسی رسم تھی جو دنیائے اسلام کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک فنی علم کی نشر و اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ علاوہ ازیں شخصی حکومت کے طریقہ نے (مستقلاً یا عارضی طور پر) صناعوں کی جماعتوں یا انفرادی کاریگروں کے نقل مقام کو جہاں ان کی خدمات مطلوب ہوتیں ممکن بنا دیا تھا۔ اور اسلامی ممالک کے مختلف اقطاع میں خاندانوں کے عروج و زوال نے ایسے حصوں سے جن کی خوش حالی کا آفتاب گہنا گیا تھا، صناعوں کو اپنی مرضی و اختیار سے ایسے حصوں میں منتقل ہونے پر آمادہ کیا جہاں کسی نئے اولوالعزم حکمران کے عروج نے مزید نفع بخش روزگار کا میدان پیدا کر دیا تھا۔

اگرچہ ان حالات نے اسلامی فن تعمیر کو ایک مسلمہ اتحاد مزاج بخشا، لیکن انھوں نے نسلی، یا جغرافیائی، یا آب و ہوا سے پیدا ہونے والی خصوصیات کے اظہار کو مفلوج نہیں کیا۔ اس طرح اگرچہ ہم مصر یا شمالی افریقہ میں ایسے تعمیری کاموں سے دوچار ہو سکتے ہیں جو ایران یا مسوپٹیمیا کے فن تعمیر سے مشابہت رکھتے ہیں، تاہم بحیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی صنعت موجود ہے جو مصری یا شامی کام سے شمالی افریقہ کے کام سے، مسوپٹیمیا کے کام سے اور ایرانی کام سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت ممتاز اور واضح ہے۔

ایک طرف شام کے پہاڑی ملک اور بعد میں اتنے ہی پہاڑی ایشیائے کوچک کے ملک اور دوسری طرف مسوپٹیمیا کے ریگیڑی ملک کو فتح کر کے اسلام نے مشرقی بحر روم کے سنگی معماروں اور ایشیائے کوچک کے خشتی معماروں کی اختلافی روایتوں میں قریبی ربط پیدا کر دیا۔ اسلامی فن تعمیر کی مخصوص مزاجی کیفیت اسی ربط کی رہین منت ہے۔ مصر میں، جو سنگی اور خشتی معماروں کے لئے یکساں موزوں ملک ہے۔ تفوق و برتری کے لئے ایک طرح کی مسابقت پیدا ہو گئی۔ اور مصر ہی میں جو خوش قسمتی سے مغلوں کی غارت گری سے بچ گیا، مسابقتی ترقی اور اس کے نتائج کا سب سے بہتر طور پر مطالعہ کیا جاسکتا اور انھیں سراہا جا سکتا ہے۔

مفتوحہ ملکوں میں اسلام نے نہ صرف تقریباً ہر ممکنہ قسم کے صناع اور ایسے ماہر معمار جو عمارتوں کے مرکزی خطوط کو مسلمہ اصولوں پر قائم کرنے کے قابل تھے، پائے، بلکہ ان ملکوں میں ہر قسم کا تعمیری مسالہ بھی اس کے ہاتھ لگا۔ یہ قابل حصول تعمیری مسالے نہ صرف خام حالت میں تھے یا پتھر کی کانوں میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ان میں وہ بھی مسالے شامل تھے جن پر مکمل اور اکثر دیدہ ریزی سے کام کیا گیا تھا۔ ہمیشہ یہ ضروری نہ تھا کہ اس مسالے کو ایسی عمارتوں سے حاصل کیا جائے جنھیں ان کے مکین ابھی استعمال کر رہے تھے۔ کیونکہ تمام مفتوحہ ممالک میں اور خاص کر ان ممالک میں جو مغرب میں واقع تھے اور روما اور بازنطینیہ کے صوبے رہ چکے تھے۔ قبل مسیحی تمدن کی اثری باقیات کام کئے ہوئے تعمیری مسالوں کے

گویا نہ ختم ہونے والے معدن بنے ہوئے تھے۔ اور آج تک بھی ان کے نہ ختم ہونے کا یہ حال ہے کہ یہ یادگاریں آج بھی لوگوں کے مکانات کی تعمیر کے لئے مسالہ فراہم کرتی ہیں۔ کاری گروں اور مسالوں کے ان ماخذوں کے علاوہ فتح مندی نے اسلام کو بے حساب محاصل کا بھی مالک بنا دیا تھا۔

۶۲۲ء میں تعمیر شدہ اسلامی فن تعمیر کے اولین نمونے مدینہ کی مسجد النبی کا جو حال بیان ہو چکا ہے اس میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عربوں کے فتوحات حاصل کرنے سے پہلے اسلام کے تعمیری وسائل کا پیمانہ ان کی ضروریات کو انتہائی سیدھے سادے طریقہ پر ظاہر کرنے کے لئے بالکل کافی تھے۔ ابتدائی فتوحات ــــ شام اور بین النہرین (مسوپٹیمیا) کی فتوحات ــــ کے بعد پہلی مسجد جو تعمیر کی گئی وہ ۶۳۹ء میں بہ مقام کوفہ سعد ابن ابی وقاص کی بنائی ہوئی مسجد تھی۔ اگرچہ سایہ کی بنیادی ضرورت کے سادے سے جواب کے سوا اس میں کچھ نہ تھا، لیکن یہ عمارت ایک ایسے خاکہ کی حامل تھی جو مسلمانوں کے حاصل کردہ نئے وسائل کو ابتدائی طور پر کام میں لانے کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کا چھت مسجد نبوی کی طرح کھجور کے تنوں پر نہیں بلکہ مرمر کے ستونوں پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ ستون حیرا کے ایک قدیم شاہی محل سے منتقل کئے گئے تھے[۵]۔ کوفہ اور بصرہ اولین شہر تھے جو عربوں نے عرب سے باہر بسائے تھے۔ کنارِ دجلہ پر واقع ایرانی دارالسلطنت مدائن اور خلیج فارس کے سرے پر

---

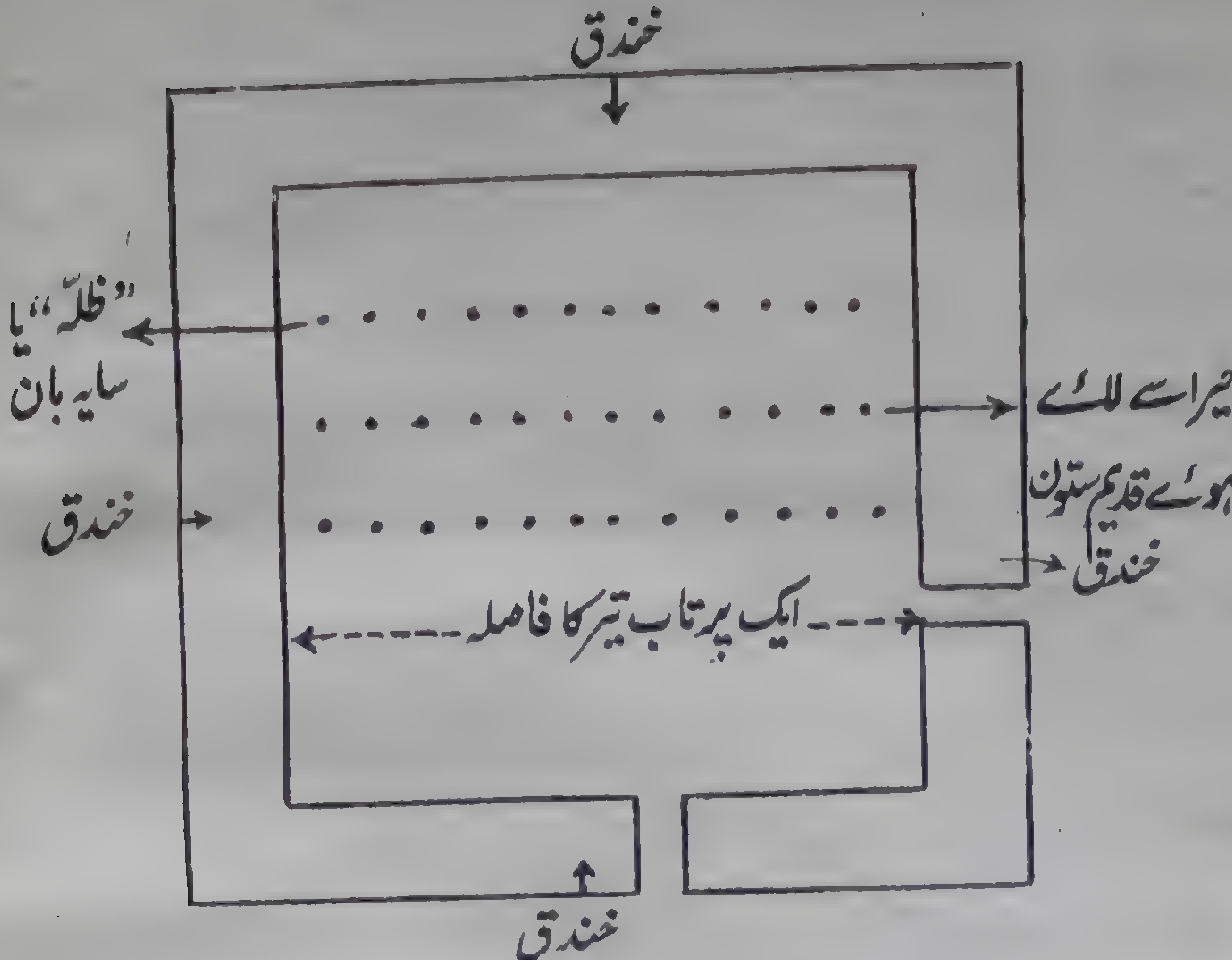
[۵] طبری، ج ۱، ص ۲۴۸۸

واقع بند ادبُلا (OBOLLA) کی فتح کے فوراً ہی بعد یہ دونوں شہر ان کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہوئے۔ نتیجتہً ۶۳۸ء میں انھوں نے کوفہ اور بصرہ کے شہر بسائے جو آگے چل کر تاریخ اسلام میں غیر معمولی شہرت حاصل کرنے والے تھے۔ پہلے پہل تو یہ شہر گھاس پھوس کے تھے۔ آگ ان میں کثرت سے لگتی تھی۔ پھر خلیفہ وقت کے حکم سے یہ دونوں شہر اینٹ سے بنائے گئے۔ خلیفہ نے تاثر اور شکایت کے انداز میں لکھا:۔ "نقل مقام کرنے والا خیمہ ہی مجاہد کا صحیح مقام ہے لیکن اگر تم ایک مستقل سکونت ہی چاہتے ہو تو یوں ہی سہی"[۱]

کوفے کی مسجد کا نقشہ مربع تھا، ایک عرب مصنف[۲] نے اس کا طول ایک "غلوہ"، یا ایک پرتاب تیر کا فاصلہ دیا ہے۔ لین کی تشریح کے مطابق ایک پرتاب تیر کو بعض ۳۰۰ سے ۴۰۰ ذرع اور بعض ۲۰۰ ذرع کے مساوی سمجھتے تھے۔ یہ فرض کرکے کہ یہ طول ۲۰۰ ذرع کے مساوی تھا، کوفے کی مسجد کا ہر ضلع طول میں مدینہ کی مسجد النبی کے ایک ضلع کا دگنا تھا۔ کوفے کی مسجد کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اس کے رقبہ کی حدبندی ایک احاطہ کی دیوار سے کرنے کی بجائے ایک خندق سے کی گئی تھی اس طرح حد بندی کئے ہوئے رقبہ میں ایک عمارت (جسے "ظلہ" یا سایۂ بان سے تعبیر کیا گیا ہے) کھڑی کی گئی۔ ایسی چھت ڈالنے کے لئے، جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، ہمسایہ شہر حیرا سے ستون لائے گئے تھے۔ یہ واضح ہے کہ ظلہ یا سایہ بان پورے

---

[۱] خلافت۔ از سر ولیم موئر، ص ۱۲۳۔ [۲] طبری ج ۱، ص ۲۴۸۸ منقول از گسٹ



شکل ۲۔ کوفہ کی مسجد کا قیاسی نقشہ

رقبہ پر چھایا ہوا نہ تھا۔ اگر بعد کے مدارج ترقی پر غور کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ سب سے بڑے باب الداخلہ کے مقابل رقبہ کے آخری حصہ پر پھیلا ہوا تھا، اور مابقی رقبہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا جسے "صحن" کہا جاتا ہے۔

۶۴۲ء میں کوفہ کی مسجد کی تعمیر کے چار سال بعد مصر میں عربوں نے اس مقام سے کسی قدر جنوب میں فسطاط نامی شہر بسایا جو بعد میں شہر قاہرہ کے لئے منتخب کیا گیا۔ فسطاط میں مصر کے نامور فاتح عمرو ابن العاصؓ نے ایک نہایت سیدھی سادی سی مسجد بنوائی۔ وہ عالی شان مسجد جو اب جامع عمرو کے نام سے مشہور ہے اسی کے محل وقوع پر واقع ہے، لیکن مسلسل تعمیر و ترمیم کی

وجہ سے اصلی مسجد کی کوئی چیز اس میں باقی نہیں رہی ہے۔ اس ابتدائی مسجد کا حال عرب مصنف المقریزی نے بیان کیا ہے۔ اپنے بیان میں اس نے مسجد کے خاکہ میں متعدد اہم عناصر کے نشو و ارتقائے سے متعلق دلچسپ معلومات مہیا کی ہیں۔

جامع عمرو طول میں صرف پچاس ذرع اور عرض میں تیس ذرع تھی۔ اس کے اطراف ایک راستہ بھی بنا ہوا تھا۔ مکّہ کی سمت پر جو دیوار تھی اس میں ایک قبلہ تھا جو نماز کے لئے سمت کا تعین کرتا تھا۔ قبلہ کے بنانے میں رسّیوں کے استعمال کرنے کا ذکر کیا گیا ہے[1]۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ ایک بڑا سا پتھر تھا۔ سمت نماز کے تعین کا یہ طریقہ بعد میں "محراب" کی صورت میں بدل دیا گیا۔ المقریزی کے بیان کے مطابق محراب کی ایجاد مختلف لوگوں سے منسوب ہے[2]۔ بعض کہتے ہیں کہ مسلمہ ابن مقلا نے جسے خلیفہ معاویہؓ نے مصر کا والی مقرر کیا تھا، پہلی محراب بنوائی جب کہ انھوں نے ۶۷۳ء میں مسجد عمرو کی توسیع کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ الولید کے چچازاد بھائی عمر بن عبدالعزیز نے پہلی دفعہ دنیائے اسلام کو محراب سے متعارف کرایا جب کہ انھوں نے الولید (۷۰۵–۷۱۵ء) کے عہد میں مدینہ کی مسجد النبی کی از سر نو تعمیر و تزئین کی تھی۔ ایک اور عرب مصنف[3] کی ایک

---

[1] مقریزی، ج ۲، ص ۲۴۸

[2] ایضاً، ص ۲۴۷

[3] ابن الزیات، ص ۱۴۲، منقول از گسٹط

عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے جامع عمرو کا خاکہ ایک عیسائی نے بنایا تھا جو المقاؤقیس کا بھتیجا تھا۔ مسجد میں اندرونی کھلا حصّہ یا صحن نہ تھا۔ اور گرما میں مسلمان مسجد کے باہر اس کھلے حصّہ میں (جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دس گیارہ فٹ سے زیادہ چوڑا نہ تھا) بیٹھتے تھے جو مسجد اور بیت عمرو کے درمیان واقع تھا۔ اس میں چھ دروازے تھے۔ اور قبلہ کی دیوار کے سوا ہر دیوار میں دو دو در تھے۔ عمرو ابن العاصؓ نے وہ اولیں ممبر بنوایا جس کا ذکر ہمارے علم میں آتا ہے۔ بعد میں ممبر اسلامی عبادت گاہ کا سب سے اہم اور تقریباً واحد فرنیچر بن گیا۔ اور اس کے خاکے اور تعمیر پر بڑی توجہ صرف ہونے لگی۔ خلیفۂ ثانی عمرؓ نے عمرو بن العاص کے ممبر کو ناپسند کیا بلکہ آپ نے سرے سے ممبر ہی کی مخالفت کی۔ آپ نے اس کے توڑ دینے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "یہ کافی ہے کہ عمرو اپنے پیروؤں کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے وقت کھڑے رہیں"۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں انتہائی محتاط عمرؓ کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمرو ابن العاص نے دوسرا ممبر لگوا دیا جسے نوبیا کے عیسائی بادشاہ ذکریا نے انھیں تحفتہً بھیجا تھا۔ یہ ممبر ایک نصرانی کلیسا سے لایا گیا تھا، اور بادشاہ نے اس کے نصب کرنے کے لئے دندرا (DENDRA) کے باشندے بقطور (VICTOR) نامی نجّار کو بھیجا تھا[۵]۔ مقریزی نے اپنی ایک عبارت میں جس کا مفہوم مبہم سا ہے، بتایا ہے کہ مروان بن محمد کے عہد تک خطبہ "لکڑیوں پر" ہوتا تھا، اور مروان بن محمد نے ۱۲۲ھ

---

[۵] مقریزی ج ۲، ص ۲۴۸۔

(۶۷۵۸) میں ان کی جگہ ممبر استعمال کرنے کا حکم دیا۔
ایک اور اہم خصوصیت "مقصورہ" یا امام کی جائے نماز کو مابقی مسجد سے علیٰحدہ کرنے والی اوٹ کی ایجاد خلیفہ عثمانؓ (۶۴۴-۶۶۵۶) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ نے مدینہ کی مسجد النبی میں ایک خشتی مقصورہ بنوایا تھا[۱]۔ مقصورہ میں ایک دروازہ تھا اور اس میں سے جماعت امام کو دیکھ سکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ولید (۷۰۵-۷۱۵ء) کے عہد میں اس خشتی مقصورہ کی جگہ آہنوسی مقصورہ بنوایا تھا۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق[۲] لفظ مقصورہ کا اطلاق نہ صرف اوٹ پر ہوتا ہے بلکہ اوٹ سے محصور کئے ہوئے حصّہ اور اس کی محراب اور اس میں کی یا اس سے قریب کی ہر شئے پر بھی ہو سکتا ہے جو نماز باجماعت کے وقت سلطان کے لئے مختص ہو۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ایسا محصورہ خلافت بنو امیہ کے بانی معاویہؓ (۶۶۱ء-۶۸۰ء) نے نماز کے دوران میں اپنے پیش رو خلیفہ علی کرم اللہ وجہ (۶۵۶-۶۶۶۱) کی شہادت اور اسی کے ساتھ فرقہ خوارج کی حضرت عمرؓ اور معاویہؓ کی جان لینے کی کوشش کے نتیجہ کے طور پر ایجاد کیا تھا۔

جب مسلمہ ابن مخلدؓ نے ۶۸۳ء میں جامع عمرو کی توسیع کی تو انھوں نے دیواروں پر آہک پاشی کرائی یا دیواروں اور چھت پر استرکاری کی اور ان کو مزین کیا[۳]۔ اصل مسجد میں کسی

---

[۱] مقریزی ج ۲، ص ۲۴۷ ۔ [۲] PROLEGOMENES HISTORIQLES ج ۲، ص ۷۲ ۔ [۳] مقریزی، ج ۲، ص ۲۴۸

قسم کی تزئین و آرائش کا کوئی کام نہ تھا۔ المقریزی نے ایک روایت بیان کی ہے[1] کہ خلیفہ معاویہؓ (۶۶۱ء — ۶۶۸۰ء) نے جامع عمرو کے لئے ایک "صومعی" یا مینار بنانے کا حکم دیا، اور معاویہؓ کے مقرر کردہ والی مصر مسلمہؓ نے ۶۷۳ء میں ایسے چار مینار بنوائے ان میں سے ہر ایک مینار میں زینے موجود تھے۔ اور داخلہ سڑک کی جانب تھا۔ یہ مینار مسجد کے چاروں گوشوں پر تعمیر کئے گئے تھے اور کہا گیا ہے کہ مسلمہؓ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کی ابتدا کی۔ المقریزی کے بیان کے مطابق مسلمہؓ کے عہد میں مینار کا وجود نہ تھا۔ لیکن ایک دوسرے عرب مصنف ابن الزیات کی تصانیف میں ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ جامع قدیم یا فسطاط کی قدیم مسجد میں کہا جاتا تھا کہ ایک مربع مینار سنہ ۱۵ھ (۶۵۶ء) میں بنایا گیا تھا، یعنی اصلی جامع عمرو کی تعمیر کے پندرہ سال بعد اور مسلمہؓ کے میناروں سے پچیس سال پہلے[2] چٹائیوں کے تکلّف کی ابتدا مسلمہؓ نے کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے سے پہلے فرش سنگ ریزوں کا ہوتا تھا[3]۔

المقریزی کے اس بیان میں اہم نقاط یہ ہیں کہ اصلی جامع عمرو میں محراب نہ تھی۔ لیکن کوفہ کی مسجد کے برعکس اس میں قبلہ موجود تھا یعنی سمت نماز کا نشان غالباً پتھر کی شکل میں دیوار میں بنایا گیا تھا

---

[1] مقریزی، ج ۲، ص ۲۴۸

[2] ابن الزیات، ص ۱۴۳، منقول از گسٹ

[3] مقریزی، ج ۲، ص ۲۴۸

عمرو ابن العاص نے پہلی مرتبہ ممبر کا اضافہ کیا، لیکن ۶۶۴۴ میں خلیفہ عمرؓ کی وفات سے پہلے اسے مسجد میں کوئی موزوں مقام حاصل نہ ہو سکا مقصورہ کی ابتدار کی تاریخ خلیفہ عثمانؓ کے عہد تک پہنچ جاتی ہے یعنی ساتویں صدی کا وسط اور ممبر کو ہمیشہ کے لئے اسلامی ـــــ بننے سے بھی پہلے ۔ مینار یا جیسا کہ ان کو صوعمی کہا جاتا تھا، پہلی مرتبہ خلیفہ معاویہ (۶۶۶۱ ـــ ۶۶۸۰) کے عہد میں ظاہر ہوئے ۔ یا اگر ہم ابن الزیات کے بیان کو درست مان لیں تو ان کے ظہور کا زمانہ اس سے بھی پہلے کا ہے ۔ آخری نقطہ یہ ہے کہ جامع عمرو اپنی اصل صورت میں جس طرح بنائی گئی تھی وہ کسی تزئین و آرائش کی حامل نہ تھی ۔ اور اس تزئین و آرائش کا پہلے کوئی وجود نہ تھا ۔ یہاں تک کہ ۶۶۸۲ میں ابن مخلدؓ نے مسجد کی توسیع کے وقت اس کی ابتداء کی ۔

بہر حال یہ اسلامی فن تعمیر میں تزئین و آرائش کے استعمال کا پہلا ضبط شدہ بیان نہیں ہے، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۶۵۳ء میں فتوحات سے حاصل شدہ دولت اور غالباً شام یا ایران سے فنی امداد کے مہیا ہو جانے کی وجہ سے اس قدیم مسجد کی توسیع اور تزئین و آرائش ممکن ہو گئی جسے اکتیس سال (تقریباً ایک پشت) قبل رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں تعمیر کی تھی ۔ اس میں کھجور کے تنوں کی جگہ ترشے ہوئے پتھر کے پائے لگائے گئے ۔ دیواریں بھی اسی مسالے سے دوبارہ اٹھائی گئیں ۔ کندہ کاری اور قیمتی پتھروں کی منبت کاری سے کام لیا گیا۔[۹]

خلیفہ معاویہ کے عہد (۶۶۱ء — ۶۸۰ء) میں زیاد نے مسجد کوفہ کی — جس کا حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں — از سرِنو تعمیر کی[1] نئی مسجد تیس ذرع اونچی تھی۔ یہ دیواروں سے محصور کی گئی تھی اور مسقف بھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنائی کا ہر دور گھڑے ہوئے پتھر کے ایک ہی بڑے قطعہ پر مشتمل تھا۔ اور مزید استحکام اور مضبوطی کے لئے یہ پتھر نیچے اور اوپر کے قطعات سے کیلوں کے ذریعہ جکڑا ہوا تھا۔ یہ کیل فولادی تھے پتھروں میں ان کے لئے سوراخ تیار کئے گئے تھے، اور ان سوراخوں میں ٹھونک کر انھیں سیسے کے ذریعہ جما دیا گیا تھا۔ اس مسجد کا خاکہ بنانے والے کا نام روزبیہ تھا۔ یہ ہمدان کا ایک ایرانی باشندہ تھا۔ عرب مصنف کے بیان[2] میں پایوں کے اوپر کمانوں، یا قبلہ کی دیوار میں کسی محراب، یا کسی ممبر یا کسی قسم کی تزئین و آرائش کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ بھی غیر اغلب ہے کہ اس عہد میں خلیفہ یا عوام اس بات سے مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ دوبارہ تعمیر شدہ مسجد ایک فوجی بارک کی سادگی سے مشابہ ہو۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ عمارت کی غیر معمولی بلندی (تیس ذرع) اور ساتھ ہی مدینہ کی مسجد میں بیس[2] سال قبل جس قسم کی نازک تزئین و آرائش سے کام لیا گیا تھا، اس سے واضح ہے کہ مسلمانوں کے مذاق اور طرز رہائش کی سادگی سخت گیر

---

[1] طبری، ج ۱، ص ۲۸۹۴، منقول از گنسٹ

[2] طبری، ج ۱، ص ۲۸۹۲۔

خلیفہ عمرؓ کی وفات کے بعد تیزی سے ایسی دلکشیوں سے مغلوب ہوتی جا رہی تھی جنھیں اب بھی بعض لوگ فضول اور فانی علامتیں سمجھتے تھے۔ ایک اندلسی مسلمان ابن جبیر جس نے سنہ ۱۱۸۴ ء میں کوفے کی مسجد کی زیارت کی تھی، بیان کرتا ہے کہ اس کے پائے سیسہ میں جمائے ہوئے پتھر کے تھے، اور چھت بالکل انھیں پر قائم تھا۔ اسی زمانے میں اس نے مدینہ کی مسجد کی زیارت کی، اور یہاں بھی اس نے تعمیر کے وہی طریقے دیکھے۔ اس کا بیان ہے کہ مدینہ میں پایوں پر استر کاری کی گئی تھی اور مسجد کی دیواروں کے نچلے حصہ پر مرمر لگایا گیا تھا۔ اور اوپر کے حصہ پر پچی کاری کا کام کیا گیا تھا۔ مدینہ کی یہ تزئین و آرائش آیا خلیفہ معاویہؓ کے زمانے کی تھی، یہ واضح نہیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ خلیفہ معاویہؓ کے عہد خلافت (۶۶۱ — ۶۸۰ء) کے ساتھ ہی ایک نئی اور ناگزیر چیز اسلام میں داخل ہو چکی تھی —— ایک تمنا کہ اسلام کے غیر مرئی روح کے شکوہ کو مادی طور پر کسی مناسب جال

ؔ اسلامی فن تعمیر، مصنفہ ریویرا، جس نے ابن جبیر کے سفرنامہ ہسپانیہ، صقلیہ شام و فلسطین، عراق، عرب، مصر سے نقل کیا ہے، ص ص ۱۶۴ ، ۱۸۱، ۲۵۴۔

ARCHITETTURA MUSULMANA, BY G.T. RIVOIRA,

QUOTES FROM:- IBNGIOBEIR, SCHIAPARELLI:

"VIAGGAS IN ISFAGNA, SCILLIA, SIRIA & PALESTINA,

MESOPOTAMIA, ARABIA, EGITTS."

پرعظمت قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے۔ عرب تعمیر کاروں یا صناعوں کی غیر موجودگی میں یہ تمنا ایسے ہی لوگوں کے توسط سے پوری کی جاسکتی تھی جیسے ایرانی تعمیر کار روزبیہ، جس نے کوفے کی مسجد کا خاکہ بنایا، جیسے مصری تعمیر کار جس نے فسطاط کی مسجد کا نقشہ تیار کیا، اور صناع جیسے مصری بقطور، جس نے جامع عمرو کا ممبر نصب کیا۔

سنہ ۶۳۴ میں بمقام بیت المقدس خلیفہ عمرؓ کے جس مسجد کے بنانے کا حال بیان کیا جاتا ہے اس مسجد کے اب کوئی آثار باقی نہیں رہے ہیں۔ اس مسجد کا محل وقوع وہی وسیع رقبہ تھا جس پر آج بیت المقدس کی مسجد واقع ہے۔ اس عظیم الشان مسجد کے اصلی بانی اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۸۵ - ۷۰۵) تھے۔ خلیفہ معاویہؓ کے عہد میں کوفہ کی مسجد کی متذکرہ دوبارہ تعمیر اور بیت المقدس میں عبدالملک بن مروان کی عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھنے میں کوئی بارہ سال کا وقفہ ہے۔ ان سالوں میں دنیائے اسلام میں اہم واقعات رونما ہوئے۔ یہاں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

اموی خلیفہ معاویہؓ نے سنہ ۶۸۰ میں وفات پائی یزید آپ کا جانشین ہوا۔ رسول اللہ صلعم کے نواسے حسینؓ اور رسول اللہ صلعم کے صحابیوں میں سے ایک صحابی کے فرزند ابن زبیرؓ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ دونوں مدینہ اور مکہ چلے گئے، اس کے بعد کوفے کے بعض باشندوں کی دعوت پر حسینؓ نے اپنے خاندان کے ساتھ

کوفہ جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس گروہ کے ساتھ شامل ہو جائیں جو اموی خلافت کو ناجائز سمجھتا تھا، اور خیال کرتا تھا کہ خلافت کو ہاشمی قبیلہ ہی میں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد اموی خلیفہ کے مقرر کردہ والی اور دوسرے عہدہ داروں نے حسینؓ کو اپنے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حسینؓ نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ والی کی فوجوں نے کربلا کے قریب آپ پر حملہ کیا اور آپ کو آپ کے پورے خاندان کے ساتھ نہایت سفاکی کے ساتھ تہ تیغ کر ڈالا۔ اس حزنیہ نے اس تلخ مخالفت کو اور تیز کر دیا جو خلیفہ عمرؓ کے جانشین کی حیثیت سے اموی خلیفہ عثمانؓ کے خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ اس مخالفت نے ہاشمی اور اموی خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی تھی، اور دنیائے اسلام کو ایک دوسرے کے جانی دشمن فرقوں میں بانٹ دیا تھا۔ حسینؓ کی شہادت کی خبر سن کر مدینہ والوں نے بغاوت کر دی۔ ابن زبیرؓ نے اپنے آپ کو محافظ بیت اللہ ظاہر کیا، اور یہ گویا خلافت کی طرف پہلا قدم تھا۔ یزید کی فوجوں نے مدینہ پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا، مکّہ کا محاصرہ کر لیا، اور کعبہ کو غارت کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی یزید کا انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا ایک کمزور بیٹا ہوا، لیکن اس کا عہد بہت مختصر رہا مکّہ اور مدینہ میں ابن زبیرؓ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ دمشق میں مروان نامی ایک اموی شخص خلیفہ منتخب ہوا۔ اس کا عہد بھی مختصر رہا، اس کا بیٹا عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ

عبدالملک کا اولیں مقصد اپنی حیثیت کو مستحکم بنانا اور مکہّ میں اپنے حریف ابن زبیرؓ کی قوت کو توڑنا تھا۔ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ سالانہ حج کو مکہّ کی جگہ بیت المقدس میں مقرر کیا جائے، اور بیت المقدس کو اسلام کا مرکزی مقدس مقام بنا دیا جائے[1]۔

تیس ایکڑ سے زیادہ رقبہ جس پر اب بیت المقدس کی مسجد واقع ہے، پہلے ہی سے مسلمانوں کا ایک مقدس مقام تھا۔ اسے مسجد الاقصیٰ کہتے تھے، اور اب بھی اسے یہی کہتے ہیں۔ اس کے معنی "دور کی مسجد" کے ہیں۔ اور یہ نام اسے مکہ کی مسجد (حرم کعبہ) سے ممیز کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اسی قدیم زیارت گاہ کے متعلق اعتقاد تھا کہ رسول اللہ صلعم معراج کی رات مکہّ سے یہاں تشریف لائے[2]، اسی مقام پر آپ براق پر سوار ہوئے، اور جبرئیل علیہ السلام کی معیت میں سات آسمانوں سے گزر کر عرش اعلیٰ پر پہنچے۔ پندرھویں صدی کے ایک عرب عالم امام جلال الدین السیوطی کا بیان ہے کہ یہی وہ سب سے دور مسجد ہے جس کی زیارت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے آگے اور کوئی مقام لائق تعظیم نہیں ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ مقام "بیت المقدس" کہلاتا ہے۔ واقعۂ معراج سے اس کا جو تعلق ہے اس کے سلسلے میں انھوں نے اس مقام کے خصوصی تقدس کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں خدا نے

---

[1] یعقوبی، تاریخ، ج ۲، ص ۱۱، لی اسٹرینج کا ترجمہ بلاد فلسطین و شام میں، ص ۱۱۶۔

[2] قرآن، سورۃ ۱۸، آیت ۱۔

داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کو توبہ کرنے کا حکم دیا؛ یہاں خدا نے زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کو بشارتیں دیں؛ یہاں خدا نے زمین پر چلنے یا ہوا میں اُڑنے والی مخلوق کو داؤد علیہ السلام کے زیر فرمان کیا؛ یہاں ہر رات فرشتے نازل ہوتے ہیں؛ یہاں بی بی مریم کے لئے سرما میں پیدا ہونے والے میوے گرما میں اور گرما میں پیدا ہونے والے میوے سرما میں پیدا کئے گئے؛ یہاں عیسیٰ علیہ السلام نے عالم طفلی میں گہوارہ میں بات کی۔ کہا جاتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج بیت المقدس کے سوا ساری دنیا کو فتح کرلیں گے، اور اسی مقدس گھر میں وہ تباہ کئے جائیں گے؛ اور یہیں قیامت کے روز مخلوق کا اجتماع ہوگا۔ یہیں سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس کے صخرا، کے ڈھونڈ نکالنے کی اجازت عطا ہوئی، اور یہ چٹان بننے والی دنیا کا پہلا کونہ تھا۔ اسی چٹان کے متعلق خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے: "تو میری قوت ہے، اور بے شک میں اپنی دوستی تجھ سے قائم رکھوں گا، تاکہ میری مخلوق (قیامت کے روز) تجھ پر جمع ہوسکے ۵"

علامہ جلال الدین سیوطی نے بیت المقدس اور اس کے بلند ترین مقام صخرا، کے تقدس کے بارے میں بہت سی دلیلیں پیش کی

۵ تاریخ معبد بیت المقدس، امام جلال الدین سیوطی کی عربی سے انگریزی ترجمہ از رینالڈز، ص ۲۱ ۔

THE HISTORY OF THE TEMPLE OF JERUSALEM, TRANS.

J. Reynolds.

ہیں اور ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان روایتوں کا زمانہ یا ان کی اصلیت خواہ کچھ ہو، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ رقبۂ زمین بہت قدیم زمانے سے مقدس سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مدینہ کی پہلی مسجد کا نقشہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ نمازی بیت المقدس کی طرف سجدہ ریز ہو سکیں، اور بعد میں اس میں تبدیلی کر کے مکّہ کو قبلہ بنا لیا گیا تھا۔ عبدالملک کی تجویز یہ نہ تھی کہ نماز کی سمت کو مکّہ سے پھر بیت المقدس کی طرف پھیر دیا جائے، بلکہ وہ بیت المقدس کے اس انتہائی مقدس مقام کو ایک زبردست زیارت گاہ بنا دینا چاہتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ حاجی مکّہ چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

مسجد کا محل وقوع شہر کے جنوب مشرقی گوشے میں ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں وہ وادی پھیلی ہوئی ہے جسے عرب وادی مریم کہتے ہیں۔ یہ وادی اس پہاڑی کو جس پر بیت المقدس واقع ہے، جبل زیتون سے جدا کر دیتی ہے۔

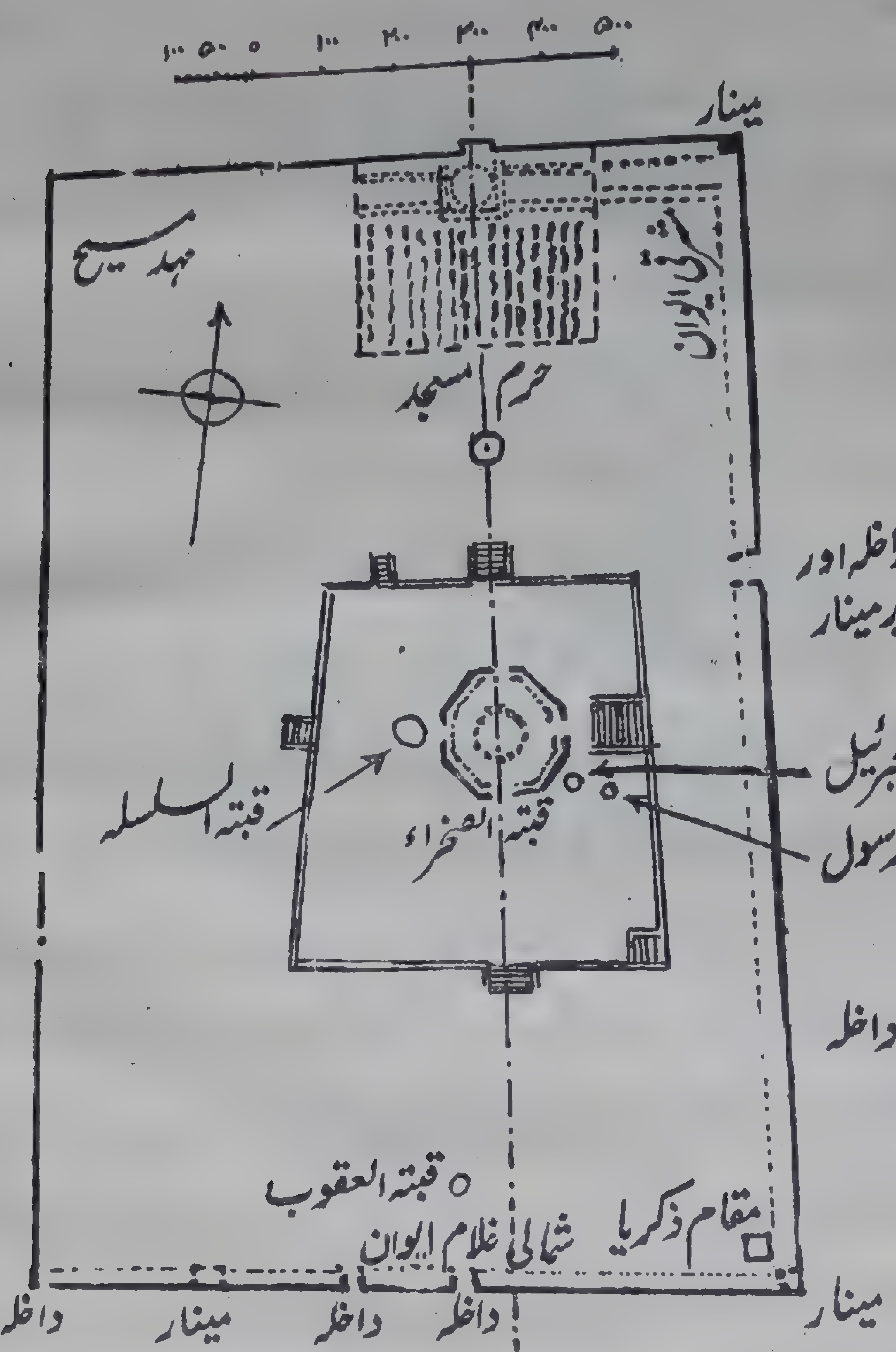
دسویں صدی کے ایک عرب مصنف المقدسیؔ کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اس مقدس مقام کے گرداگرد ایک دیوار کھینچ دی۔ المقدسی کے بیان کے مطابق یہ دیوار نہایت قدیم زمانے کی بنیادوں پر اُٹھائی گئی تھی، اور ان بنیادوں کی وہ داؤد علیہ السلام سے منسوب کرتا ہے۔ اس قدیم دیوار کے پتھروں کی لمبائی دس

ؔ المقدسی کے بیان کے لئے لی اسٹرینج کی کتاب بلاد فلسطین و شام میں اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

بکی (باع) یا اس سے کچھ کم تھی۔ اس ٹھوس بنیاد پر عبدالملک نے احاطہ کی دیوار تعمیر کی، اور اس میں نسبتاً چھوٹے لیکن خوش وضع پتھر استعمال کئے اور اس کے سرے پر گھڑ گچ کا اضافہ کیا۔ مقدسی کے زمانے میں مسجد میں داخل ہونے کے تیرہ راستے اور بیس دروازے تھے۔ پانچ راستے مغربی دیوار میں، تین راستے شمالی دیوار میں، اور دو راستے جنوبی اور تین مشرقی دیوار میں تھے۔ محصورہ رقبہ کا طول تقریباً ۱۵۰۰ اور عرض اوسطاً ۹۶۰ فیٹ ہے۔ طولی خطِ محور شمالاً جنوباً گذرتا ہے۔ مقدس چٹان (شکل ۳) شمالی اور جنوبی حدود کے درمیان وسط میں اور مشرقی بازو سے ۳۵۰ اور مغربی بازو سے ۶۰۰ فیٹ کے فاصلہ پر واقع ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ کوفے کی مسجد میں ایک "ظلّہ" یا سایہ بان بھی قائم کیا گیا تھا۔ یہ سایہ بان غالباً احاطے کے اس سرے پر قائم کیا گیا تھا جو مکّہ کی سمت میں واقع تھا (شکل ۲) بیت المقدس میں عبدالملک نے اسی اصول کی پیروی کی۔ اگرچہ وہ اس کام کو بڑے وسیع پیمانہ پر کر رہا تھا۔ کوفہ کی مسجد کے دو ایکڑ قطعۂ زمین پر چھت ڈالنا مشکل بھی تھا اور غیر ضروری بھی، بیت المقدس کی مسجد جو تیس[۳۰] ایکڑ یا اس سے زیادہ قطعہ زمین پر واقع تھی، اس پر چھت ڈالنا اور بھی غیر ضروری اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ حجم کے علاوہ یہاں اور بھی مشکلیں درپیش تھیں۔ کوفہ میں مسجد کے تعمیر ہونے سے پہلے اس کے محل وقوع کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی روایات وابستہ نہ تھیں، لیکن بیت المقدس میں مسجد کا محل وقوع ایسی روایتوں

سے پُر تھا۔ المقدسی، صخراء کے علاوہ مسجد کے رقبہ میں اور بہت سے غاروں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت جبرئیل سے، دو سے زیادہ آنحضرت صلعم سے، ایک یعقوب علیہ السلام سے،



شکل ۲۔ جامع عبدالملک واقع بیت المقدس کے اہم خط و خال۔
یہ مسجد الاقصیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

ایک عیسیٰ علیہ السلام سے، ایک داؤد علیہ السلام اور ایک بی بی مریم سے منسوب ہے۔ پس زائرین کے لئے کشش پیدا کرنے کی کسی تجویز میں بس ایسی ہی باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔ یہاں باجماعت نماز کے لئے مسقف رقبہ ہی مہیا کرنا نہ تھا بلکہ بہت سے مقدس مقاموں کی نشان دہی کرنا اور ان کی اہمیت جتانے کے لئے ان پر مناسب عمارتیں یا زیارت گاہیں بھی تعمیر کرنا ضروری تھا۔ مسجد سے نزدیک ہی مغرب میں ضریح مسیح کا مقدس کلیسا واقع تھا، اور آج بھی واقع ہے۔ اور اس کے مغرب میں گنبد والا مدور کمرہ ہے جس میں خود ضریح واقع ہے۔[۵] مقدسی اپنے مسجد کے بیان میں ان مشہور مقامات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے: "مسجد (واقع بیت المقدس) دمشق کی مسجد سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت ہے، کیونکہ اس کی تعمیر کے وقت ان کے پیش نظر یروشلم میں عیسائیوں کا کلیسا بطور حریف موجود تھا۔ اس لئے انھوں نے اس مسجد کو دوسری مسجدوں سے زیادہ شان دار تعمیر کیا۔" ضریح مقدس اور اس کے باسلیقی کلیسا نے عبدالملک اور اس کے معماروں کو نہ صرف اس سے بڑھ جانے کی دعوت دی بلکہ انھیں غالباً یہ بھی سمجھایا کہ اس کا نقشہ بھی ایسا ہی تیار کیا جائے جس سے ایک خط محور کے ذریعہ مسجد کا

---

[۵] اس وقت مدور کمرے کا بہت بڑا حصہ اور خاص کر بہ حیثیت مجموعی پورا کلیسا جس حالت میں ہے وہ عبدالملک کے بعد سے متعدد بار تعمیر و ترمیم کا نتیجہ ہے۔

مسقف حصہ اور ان کا سب سے مقدس مقام ایک ہی علاقہ میں آجائیں۔ مسجد اقصیٰ کے اس نقشے (شکل ۳) سے ظاہر ہے کہ مسجد کا مسقف حصہ اور قبتہ الصخراء ایک ہی خط محور پر واقع ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح باسلیقی کلیسا اور ضریح مسیح ایک ہی خط محور پر بنائے گئے ہیں۔

کوفے کی مسجد کے بیان میں طبری مسقف یا ڈھکے ہوئے حصہ کے لئے "ظلہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بیت المقدس کی مسجد کے بیان میں اس کے ڈھکے ہوئے حصہ کو المقدسی "مغطی" کہتا ہے۔ ایک ایرانی سیاح ناصر خسرو (۱۰۴۷ء) جس نے فارسی میں اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ کبھی "پوشش" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو عربی لفظ "مغطی" کی طرح ڈھکے ہوئے کے معنی دیتا ہے، اور کبھی عربی لفظ "مقصورہ" استعمال کرتا ہے جس کے معنی اوٹ اور اوٹ دار مقام کے ہیں۔ میں خلط مبحث سے بچنے کے لئے مسقف حصہ کے لئے "حرم" کا لفظ استعمال کرونگا۔

عبدالملک نے اپنا حرم یا مسقف حصہ احاطے کی جنوبی دیوار کے مقابل بنایا، یعنی اس دیوار کے مقابل جو مکہ کی سمت میں تھی۔ غالباً ایک محراب بھی اس دیوار میں بنائی گئی تھی، کیونکہ یہ خصوصیت کچھ پہلے ہی ظاہر ہو چکی تھی، اور سنہ ۶۷۳ء میں مسلمہؓ نے جامع عمرو کی توسیع میں اسے داخل کیا تھا۔ المقدسی کا بیان ہے کہ حرم کا یہ حصہ احاطے کی مشرقی دیوار تک پھیلا ہوا نہ تھا (اور آج بھی یہاں تک پھیلا ہوا نہیں ہے)۔ اس کے دو

---

۵ بلاد فلسطین وشام، مصنفہ لی اسٹرینج۔

PALESTINE UNDER THE MOSLEMS BY GUY L' ESTRANGE.

سلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ امیر المومنین عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اسے مغربی رقبہ میں بنایا جائے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اسے مشرقی جانب بڑھایا جاتا تو اس کا درمیانی خط یا خط محور (جس پر محراب بنایا گیا تھا) صخرائے مقدس کے مقابل (یعنی صخراء کے خط محور کے مقابل) نہ ہو سکتا۔ اور یہ بات مسلمانوں کو گوارا نہ ہوتی۔

حرم اور زیارت گاہ دونوں عمارتوں کے لئے واحد خط محور عیسائی اور اسلامی عبادت گاہ اور زیارت گاہ میں ایک یہی مشترک خصوصیت نہیں۔ ضریح مسیح اور صخراء مقدس، دونوں گنبد سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ عیسائی باسلیقی کلیسا اور اسلامی عبادت گاہ دونوں میں ایک وسیع صدر دالان تھا۔ اور اس کے دونوں جانب بغلی دالان تھے اگرچہ اسلامی عبادت گاہ میں بغلی دالانوں کی تعداد باسلیقی کلیسا سے زیادہ تھی۔

المقدسی کے بیان سے ـــ اور یہ ہمارے پاس سب سے قدیم بیان ہے ـــ معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں اس نے حرم کو جس حال میں دیکھا وہ یہ تھا: حرم میں ایک شان دار صدر دالان تھا۔ (اور اب بھی موجود ہے) جو محراب تک جاتا تھا، اور اس پر پایہ دار لکڑی کا چھت ڈالا گیا تھا۔ محراب کے سامنے اس کے پاس ہی ایک گنبد بنایا گیا تھا۔ اس گنبد کا قطر موجودہ گنبد سے جو اسی مقام پر بنایا گیا ہے، کہیں زیادہ تھا۔ صدر دالان کے ہر پہلو میں سات بغلی دالان تھے، جنہیں سات کمانوں والے چھتے سے جدا کیا گیا تھا۔ صدر دالان میں داخل ہونے کا راستہ شمال میں تھا، اور یہ ایک بڑا سا دروازہ تھا اس کے دائیں بائیں سات سات اور دروازے تھے جو سب مل کر تعداد

میں بندرہ ہو جاتے تھے۔ مشرق میں گیارہ دروازے تھے، مغرب کی طرف کسی دروازے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ موسم سرما میں بیت المقدس مغرب کی طرف سے آنے والے شدید طوفان بادو باران میں گھر جاتا ہے۔ اس لئے اس سمت پر بھی کم سے کم داخلے بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقدسی نے جس عمارت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان میں "محراب کے اطراف کے حصّہ" کے سوا عبدالملک کی اصلی مسجد کی اور کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مسجد کا بقیہ حصّہ بنی عباس کے عہد میں زلزلہ سے گر پڑا تھا۔ کہتے ہیں خلیفہ ہارون الرشید کے باپ خلیفہ المہدی نے افتادہ حصّوں کو تعمیر کرا دیا تھا۔ مقدسی بیان کرتا ہے کہ مہدی نے ان حصّوں کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم طرز پر تعمیر کیا، اور غیر افتادہ حصّہ اس تعمیر کا ایک جزو بن گیا۔ مقدسی کے عہد میں جو حصّہ بڑھایا گیا تھا، وہ مرمر کے ستونوں کے اختتام تک تھا۔ اس کا بیان ہے کہ گلی ستونوں پر مشتمل حصّہ نیا ہے۔[۵] آج بھی صدر دالان کے ستون، گلی ستون ہیں۔ ان میں محراب کی دیوار سے قریب ترین ستون کا فاصلہ اسّی فیٹ ہے۔

علی ہروی جس نے سنہ ۱۱۷۳ء میں سلطان صلاح الدین کی فتح سے کچھ سال قبل مسجد کی زیارت کی ہے، گنبد کے نیچے مربع کا

۵۔ یہ لفظ (دیکھئے مقریزی ص ۱۶۸، ۱۸۷۶ء کا اڈیشن) جس کا ترجمہ "گلی" کیا گیا ہے، "مشیدا" ہے۔ لی اسٹرینج نے اس کا ترجمہ "گچ اور چونا" کیا ہے۔ اسٹن گیاس (STEINGASS) نے "شَیَّدَ" کا ترجمہ "کسی دیوار یا عمارت کو کافی بلند کرنا، اٹھانا" دیا ہے۔

محیط ۱۶۰ ایکی (باع) بتاتا ہے۔ؔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مربع کا ہر ضلع طول میں ساٹھ فیٹ تھا۔ موجودہ گنبد کے نیچے جو مربع ہے اس کا ایک ضلع تقریباً اڑتیس فیٹ لانبا ہے۔ اس نے مرکزی "رواق" (جس سے غالباً وسطی دالان مراد ہے) کا عرض پندرہ قدم بتایا ہے، اور آج بھی اس کا عرض یہی ہے۔

یہ معلوم نہیں کہ عبدالملک کا بنایا ہوا عظیم الشان گنبد کب گر پڑا یا گرا دیا گیا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ مہدی نے رواقوں کی دوبارہ تعمیر میں اصلی چھتوں کے خطوط کو کس حد تک باقی رکھا۔ مقدسی کا "گلی ستونوں" کی طرف اشارہ اور موجودہ صدر دالان کے دونوں بازوؤں پر ستونوں کا پایا جانا — یعنی پتھر کی چنائی کے ستونوں کا پایا جانا — اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ستون مہدی (۷۷۵ء — ۷۸۵ء) کے عہد کے ہوں گے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً کمانیں بعد کی ہیں اور سر ستون بازنطینی ہیں۔ تعمیری مشکلات کی وجہ سے یہ بہ مشکل ممکن تھا کہ عبدالملک کے بنائے ہوئے ساٹھ فیٹ عریض عظیم الشان گنبد تک پہنچنے کے لئے اتنے ہی عرض کا دالان بنایا جاتا۔ لیکن یہ زیادہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ بازو کے بغلی دالانوں سے کہیں زیادہ بڑا صدر دالان اس مقصد کے لئے بنایا گیا ہوگا، اور یہ ممکن ہے کہ اصلی صدر دالان اس عرض کا ہوگا جتنے عرض کا صدر دالان آج موجود ہے۔ اس طرح موجودہ بیانات سے ہم عبدالملک کے بنائے ہوئے حرم کا نقشہ متعین کرنے

۵۔ بلاد فلسطین وشام۔ مصنفہ لی اسٹرینج

کے قابل نہیں۔ تاہم ہم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ مقدسی کی دیکھی ہوئی عمارت میں جہاں تک محراب کے اوپر بڑے گنبد تک جانے والے وسیع صدر دالان اور اس کے دونوں بازوؤں پر کے بغلی دالانوں کا تعلق ہے، یہ عبدالملک کے حرم کے اہم خط و خال ہیں۔ ابتدائی بیانات میں یہ نہیں بتایا گیا کہ آیا بیت المقدس کی مسجد میں مینار بھی تھے۔ لیکن مجیر الدین (۱۴۹۶ء) کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں چار مینار تھے، اور یہ انھیں مقامات پر واقع تھے جہاں عبدالملک کے مینار تھے۔ اس کا بیان ہے کہ ان میں سے پہلا مینار مسجد کے جنوب مشرقی گوشہ میں، دوسرا باب السلسلہ کے اوپر، تیسرا شمال مغربی گوشے میں اور چوتھا باب الاسباط اور باب الحطہ کے درمیان واقع تھا۔ چونکہ خلیفہ معاویہؓ نے جامع عمرو کے لئے مینار بنانے کا حکم دیا تھا اور ایسے چار مینار سنہ ۶۶۲ میں بنائے جا چکے تھے، اس لئے یہ غیر ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ چند سالوں بعد خلیفہ عبدالملک نے بیت المقدس میں اپنی عظیم الشان مسجد کو اس نمایاں خصوصیت سے مزین کرنے کے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ہوگا جو بلند مینار ہمیشہ ایک عمارت میں پیدا کر دیتے ہیں۔

مسجد کے نقشہ کے ارتقا میں ایک اہم عنصر چھتے دار ایوان ہے جو مقدسی کے بیان کے مطابق اس کے زمانے میں احاطے کی شمالی، مغربی اور جنوبی دیوار کے ایک حصے کے ساتھ بنایا گیا تھا (شکل ۲۳) مشرقی بازو پر کوئی ایوان نہ تھا۔ اور جنوبی بازو کے ایک حصہ پر بھی جو حرم کے مشرق میں ہے، ایوان نہ تھا۔ آب و ہوا اور محل وقوع کے حالات اس

کی توضیح کرتے ہیں کہ یہ ایوان شمالی اور مغربی بازؤں پر کیوں ہے اور مشرقی بازؤں پر کیوں نہیں۔ مشرق سے جنوب تک ایک گہری وادی پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان سمتوں میں شہر مسجد کی دیواروں سے آگے پھیلا ہوا نہیں ہے۔ اسی لئے بہت کم لوگ مشرق اور جنوب کی طرف سے مسجد میں داخل ہوں گے، اور زیادہ تر لوگ شمال اور مغرب کی طرف سے مسجد میں داخل ہوں گے جس سمت میں شہر واقع ہے اور جدھر بہت سے داخلے اور مینار بنائے گئے ہیں۔ واضح طور پر ایوان کا مقصد یہ تھا کہ شہر کی مسقف گلیوں سے مسجد میں داخل ہو کر حرم میں جانے والوں کے لئے خراب موسم میں پناہ گاہ مہیا کی جائے۔ اگرچہ مقدسی کے بیان میں کسی دروازے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ایک دروازہ حرم کی مغربی دیوار کے شمالی سرے پر موجود تھا، اور یہ دیوار حرم کو ایوان سے ملاتی تھی جو اس کے سرے تک بنایا گیا تھا۔ بیت المقدس میں سرما کا موسم نہایت شدید ہوتا ہے۔ اس کی مسجد کے اتنے وسیع کھلے رقبہ میں ایوان ناگزیر ضرورت ہے۔ اس لئے یہ شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایوان عبدالملک کے اصل نقشے کا ایک جزو نہ ہوں گے۔

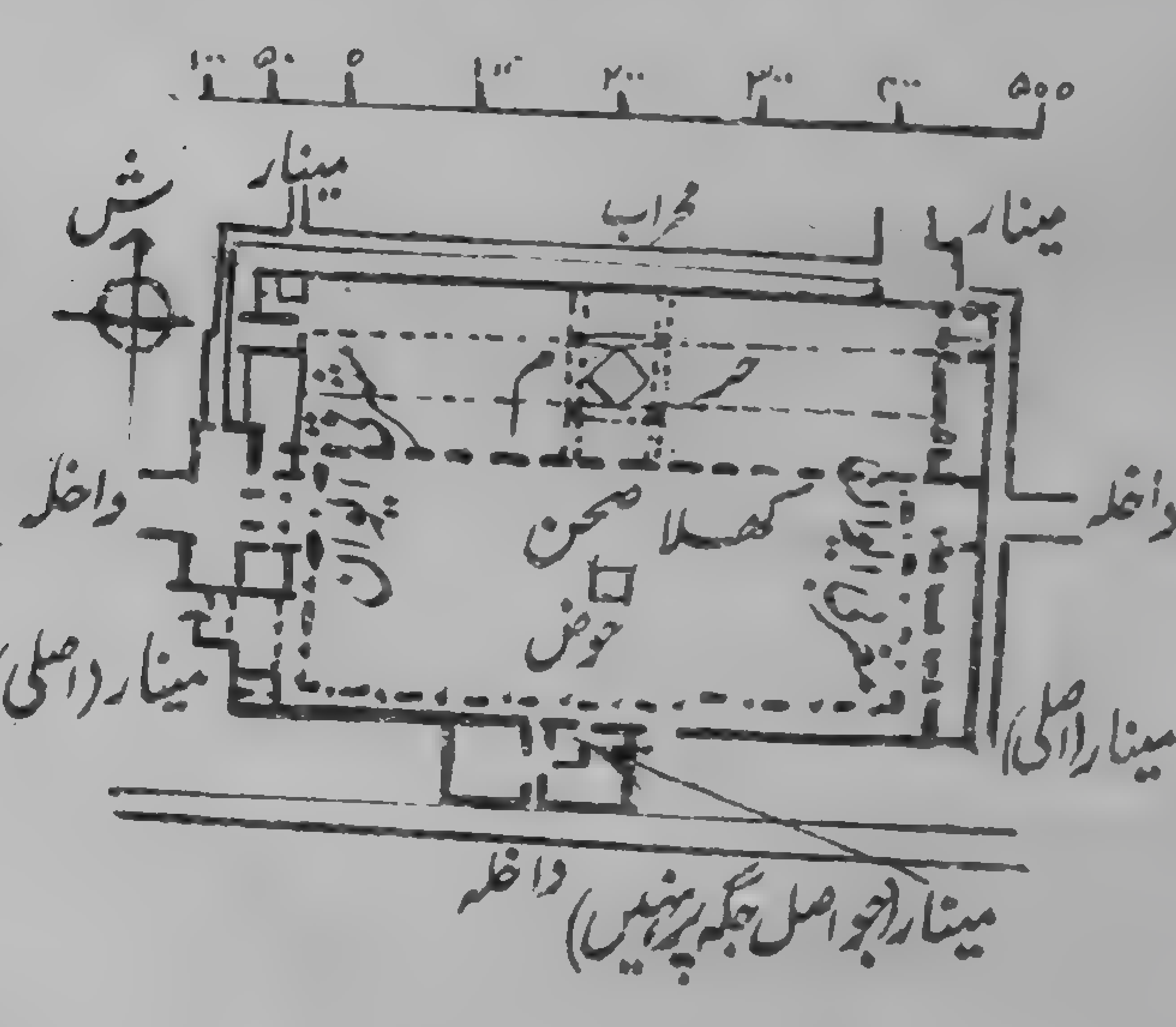
عبدالملک کے عہد سے پہلے ہی ممبر کا رواج ہو چلا تھا۔ اور ہم وثوق کے ساتھ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ایسا ہی ایک ممبر حرم بیت المقدس میں نصب کیا گیا ہوگا۔ حرم اور صخراء کی زیارت گاہ کے درمیان وضو کے لئے ایک حوض ہے۔ یہ چیز بھی عبدالملک کی

مسجد کا ایک جزو ہو گی۔ کیونکہ نماز سے پہلے وضو اسلامی فرائض
ہیں داخل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس میں عبدالملک کے اپنی
عظیم الشان مسجد کو مکمل کرنے تک باجماعت اسلامی عبادت گاہ
کی متعدد ضروریات پوری طرح تعمیری قالب اختیار کر چکی تھیں۔
دیواروں سے گھرا ہوا احاطہ گوشۂ عافیت مہیا کرتا تھا، مسقف
حرم موسم سے پناہ دیتا تھا، ممبر خطیب کو نمایاں و بلند کر دیتا
تھا، وضو کے لئے حوض مسلمانوں کو نماز کی تیاری کرنے کے قابل بنا
دیتا تھا، مینار کافی بلندی سے اذان دینے کے لئے تھے؛ لداؤ چھت
والے یا مسقف راستوں سے ہوتے ہوئے کھلے احاطے میں داخل ہو کر
مسقف حرم میں جانے والے نمازیوں کو پناہ دینے کے لئے ایوان
تھے۔ اگرچہ ان تمام ضروریات کی تکمیل کر دی گئی تھی، تاہم ان سب
کو ایک متناسب تعمیری وحدت میں پوری طرح منسلک نہیں کیا گیا
تھا۔ شہر کی نسبت سے مسجد بیت المقدس کا عجیب محل وقوع اور
مسجد میں اصل راستوں کا صرف دروازوں پر واقع ہونا، اس کے
سوا اس کا وسیع و عریض رقبہ، یہ سب چیزیں متناسب اور مربوط
اظہار کے لئے موزوں نہ تھیں۔ ایسے اظہار کا موقع دمشق میں ہاتھ
آیا۔ دمشق کی جامع کبیر کا محل وقوع شہر کے عین وسط میں ہے۔
اسی مقام پر قبل رومی عہد کا معبد رب شمس یا جوپیٹر کا معبد واقع
تھا۔ چوتھی یا پانچویں صدی میں یہ معبد ایک کلیسا بنا لیا گیا۔ اموی
خلیفہ ولید (۷۰۵ - ۶۱۵ع) نے اس کلیسا کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔

مسجد کا محل وقوع مستطیل ہے، اور اس کا رقبہ ۵۳۰ فیٹ ضرب ۲۲۰ فیٹ ہے۔

احاطہ کے شمالی اور مشرقی بازو بہ حیثیت مجموعی آٹھویں صدی کی ہیں، اور اسلامی ہیں۔ بقیہ بازو رومی اور قبل رومی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں جو کلیسا بنا تھا وہ یوحنا اصطباغی کے نام معنون کیا گیا تھا، کیونکہ یہ یقین کیا جاتا تھا کہ یہاں اس کا سر دفن ہے۔ اسلامی فتح کے بعد ہی مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان معاہدہ کے بعد کلیسا دونوں میں مساوی طور پر تقسیم ہو گیا۔ سنہ ۷۰۸ء میں اس معاہد کو ختم کر دیا۔ ولید بیت المقدس کی مسجد کے بانی عبدالملک بن مروان کا بیٹا اور اس کا جانشین تھا۔ احاطہ کے ان حصّوں کے سوا جن کے متعلق



شکل ۲۷ جامع کبیر، واقع دمشق

ہم کہہ آئے ہیں کہ وہ رومی یا قبل رومی زمانے کے تھے۔ اس نے پوری عمارت نئے سرے سے تعمیر کی۔ بیت المقدس میں مسجد مستطیل کے ان چھوٹے اضلاع پر واقع ہے جو مکّہ کی طرف واقع ہیں اور دمشق میں ایک بڑے ضلع پر۔ اسی ضلع کے وسط (دیکھئے شکل ۱۴) میں، (اور یہ جنوبی ضلع ہے) محراب بنائی گئی ہے۔ مسقف حرم احاطہ کی پوری جنوبی دیوار کے ساتھ تقریباً (۱۲۵) فیٹ عمیق بنایا گیا ہے۔ دمشق کا حرم رقبہ میں بیت المقدس کے قیاسی اصلی رقبہ حرم سے تین چوتھائی سے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن ولید نے حرم کو اتنا بڑا بنایا ہے جتنا اس کا محل وقوع اجازت دے سکتا تھا۔ اس نے حرم کو پورے جنوبی سرے پر بنایا اور مشرقی اور مغربی داخلوں (جو مشرقی اور مغربی دیواروں کے وسط میں بنائے گئے ہیں) کے جنوب میں جتنی جگہ مل سکتی تھی سب کو حرم کے لئے استعمال کیا ہے حرم میں تین عام در ہیں۔ ایک صحن میں سے ہے جو اس کے شمال میں واقع ہے، اور دو در دونوں بازؤں میں ہیں جن تک مشرقی اور مغربی دروازوں سے ایوان میں داخل ہوکر پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ایوان شمالاً شمالی دیوار تک چلے گئے ہیں، جہاں وہ ایک اور ایوان سے جوڑ دئے گئے ہیں جو شمالی دیوار سے لگا ہوا ہے۔ اس طرح شمالی دروازے سے حرم میں داخل ہونے والوں کے لئے مسقف راستہ مہیا کیا گیا ہے۔ تعمیر کار کو جن ضروریات کی تکمیل کرنی ضروری تھی، اور حجم، وضع، اور وسط شہر میں محل وقوع، تمام سمتوں سے داخلے، ان سب چیزوں سے پیدا ہونے والے حالات

نے مل کر ایک ایسا نقشہ سجھایا جس میں اہم عناصر یعنی حرم، اس کے چھتے دا
راستے، اور صحن کے درمیان وحدت اور ربط گویا مجسم ہو گیا تھا۔ تعمیر کا
نے صرف ایوانوں کو حرم سے ملا ہی نہیں دیا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ
ہی کام کیا۔ اس نے حرم اور ایوانوں کی رواقوں کے ارتفاع میں ایک
ہی تعمیری طریقہ استعمال کیا۔ ایسا کر کے اس نے صحن کو اپنی وضع کی ایک
خاص تعمیری خصوصیت عطا کی، اور اس کے ساتھ ہی اسے نہایت موثر
طور پر ایوانوں اور حرم دونوں سے مربوط کر کے اسے ایک تعمیری
کل کی شکل دے دی۔ صحن جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس طرح
ارتقاء پاتا رہا، مسجد کی طرز تعمیر میں ایک اہم خصوصیت بن گیا۔

مشرقی اور مغربی دونوں ایوانوں کے روکار میں نو گول
سری کمانوں کی قطار استعمال کی گئی ہے۔ یہ کمانیں پایوں اور
ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں، اور ایک پایہ ہر دو ستونوں کے بعد
آیا ہے۔ ۱۳۲۶ء میں سیاح ابن بطوطہ نے اس مسجد کی زیارت کی
ہے، اس نے شمالی ایوان میں بھی یہی طرز دیکھی تھی[۵]۔ آج کل اس ایوان
میں کوئی ستون نہیں بلکہ صرف پائے ہیں۔ بے شبہہ اصلی ستونوں کو
چودھویں صدی کے بعد کسی وقت نکال لیا گیا اور انھیں کسی اور
عمارت میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایوانوں کے اوپر کے چھتوں میں
چھوٹی کمانوں کے محراب یا دریچوں کی ایک قطار جوڑوں کی صورت
میں ترتیب دی گئی ہے۔ ہر جوڑے کی کمانیں پایوں پر اٹھائی گئی

۵۔ ابن بطوطہ، ج ۱، ص ۲۰۰؛ ریویرا کی محولہ کتاب اسلامی
فن تعمیر ص ۹۰۔

ہیں۔ اور پایے پنچے کے چھتے کے سہاروں پر عموداً قائم کئے گئے ہیں اور چھوٹے ستون (جو پایوں سے وزن میں کم ہیں) چھتے کے تابعوں پر نصب کئے گئے ہیں۔ حرم کا شمالی روکار ایوانوں کے روکار کے مماثل ہے، البتہ اس میں ستونوں کی جگہ پایے استعمال کئے گئے ہیں ستونوں کے گاؤدم ڈھڑوں کے درمیان لکڑی یا کسی اور چیز کی اوٹ لگانے کی بہ نسبت تراشیدہ پتھر کے پایوں کے درمیان ایسا اوٹ لگانا آسان ہے۔ اور حرم کو صحن سے جدا کرنے والے چھتے میں پایوں کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمیشہ اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ صحن اور حرم کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا مقصورہ بنایا جائے۔ مقصورہ کی اصل وضع کیا تھی، یہ معلوم نہیں ہے۔

حرم کے شمالی پیش کے وسطی کھانچے میں ایک در ہے۔ اس کھانچے کے اوپر ایک مثلثی روکار بنا ہوا ہے، اور ہر بازو پر دو گرڑ گچ صحن میں آگے کی طرف نکلے ہوئے ہیں، اور حرم سے محراب تک جانے والے عریض دالان کی کمانوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس دالان میں نیم قوسی تین کھانچے ہیں جو حرم کی شمالی اور جنوبی دیواروں میں بنے ہوئے نیم ستونوں اور پایوں پر بنائے گئے ہیں۔ یہ پائے جو تعداد میں چار ہیں، وسطی کھانچے کے چاروں گوشوں میں ایک ایک واقع ہیں، اور اتنے ہی عریض (چھ فیٹ) ہیں جتنے کہ دالان میں بنی ہوئی کمانیں ہیں اور دس فیٹ چھ انچ طویل ہیں۔ وسطی کھانچے کے اوپر ایک گیند چار کمانوں پر بنایا گیا ہے جو چار پایوں پر قائم کی گئی ہیں۔ ہر پایہ کی پیمائش دس فیٹ

چھ انچ ضرب آٹھ فیٹ ہے اور یہ (کس زمانہ میں بنے ہیں اس کا علم نہیں) صدر دالان کے چھتّوں کی کمانوں کے پایوں کے جواب میں بنائے گئے ہیں۔ زیریں تعمیر کے مربع کی اس مثمن میں تبدیلی کو جس پر گنبد بنایا گیا ہے، مربع کے گوشوں کے اطراف کمان دار طاق بناکر موثر بنایا گیا ہے۔ وسطی دالان کے دونوں بازوؤں کے اقطاع کو دو چھتّوں کے ذریعہ تین بغلی دالانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو صدر دالان سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی چلی گئی ہیں۔ یہ چھتّے مذکورہ بڑے پایوں سے ملا دئے گئے ہیں۔ چھتّوں میں گول سری کمانیں ہیں اور یہ سنگ مرمر کے یک سنگی ستونوں پر یونانی رومی سرستونوں کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ بغلی دالانوں پر پختہ چوبی چھت ڈالی گئی ہے۔ مسجد کے صحن میں وضو کے لئے ایک حوض ہے۔ آج کل مسجد کے تین مینار ہیں، ایک ماذنتہ العروس شمالی در پر، دوسرا ماذنتہ القائت بے جنوب مغربی گوشے پر اور تیسرا ماذنتہ المسیح جنوب مشرقی گوشے پر واقع ہے۔

اگرچہ اس مسجد کی بنا کے بعد سے اس میں بہت سے ردوبدل ہو چکے ہیں، تاہم اس کا نقشہ، اور اس کی عمومی ترتیب اس عمارت سے مطابق ہے جسے مقدسی نے دیکھا اور ۷۰۸ء میں خلیفہ ولید کی تعمیر کردہ بیان کیا ہے۔ البتہ اس کا گنبد اس عہد کا نہیں ہے۔ پہلا گنبد ناکافی بنیادوں کی وجہ سے گر پڑا[۵]۔ بعد میں دوسرے گنبد

---

[۵] مقریزی، تاریخ "المملوک المصر" مرتبہ کواٹرمیر، ج ۲، ضمیمہ ۱، ص ۲۶۲ بہ حوالۂ ریویرا کی کتاب "اسلامی فن تعمیر" ص ۸۲ –

بنتے رہے، ایک سنہ ۱۰۸۲ء میں چوبی اور ایک پندرھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پتھر کا بنایا گیا تھا۔ ہمارے پاس ولید کے گنبد کی تفصیلات موجود نہیں، اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ مربع زیریں حصّہ پر کس طرح قائم کیا گیا تھا۔ مقدسی بس اتنا ہی بیان کرتا ہے کہ وہ بہت بڑے پیمانہ پر بنایا گیا تھا۔

ولید کی مسجد کے چار مینار تھے جو گوشوں پر اُٹھائے گئے تھے۔ جنوب مشرقی اور جنوب مغربی گوشوں پر ان کے نچلے حصّے ابھی تک باقی ہیں۔ ہر گوشے پر ایک مینار کی ترتیب بھی دوبارہ تعمیر شدہ جامع عمرو میں چھبیس سال قبل اختیار کی جا چکی تھی۔

ولید کی مسجد کو نہایت پُرتکلف طریقہ پر سجایا گیا تھا۔ حرم کی دیواریں اندر اور باہر دونوں طرف نیچے سے اوپر تک سنگ مرمر اور پچی کاری سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ گرڈ گچ بھی، جو اب غائب ہو گئے ہیں پچی کاری سے ڈھکے ہوئے تھے۔ طبری کی ایک عبارت کی رو سے شہنشاہ قسطنطنیہ نے صناعوں کو مہیا کیا تھا۔

چھت گیریاں سنگ ستر میں بنے ہوئے گل بوٹوں میں ڈھکی ہوئی تھیں، اور ان پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے۔ استرکاری میں کتبات کی پٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ تمام پایوں پر سونے کے پتر منڈھے ہوئے تھے۔ ستون اور کمانیں پچی کاری سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ گنبد کا اندرونی حصّہ سونے سے منڈھا ہوا تھا۔ محراب پر بھی سونا چڑھا ہوا تھا، اور اس کے اطراف عقیق اور فیروزہ کے ٹکڑے جمائے گئے تھے اور اس کے اوپر ایک نقرئی تاک

بنی ہوئی تھی۔ ابن جبیر کا بیان ہے کہ ولید نے "بادشاہ روم (یعنی شہنشاہ قسطنطنیہ) کو حکم دیا" کہ وہ ۱۲۰۰۰ مزدوروں کو روانہ کرے ابن خلدون کا بھی بیان ہے کہ بادشاہ روم کو تعمیر کاروں، معماروں اور صنّاعوں کے مہیّا کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔[۵] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولید نے دھمکی دی تھی کہ اگر مزدور مہیّا نہ کئے گئے تو وہ ایشیائے کوچک پر حملہ کرے گا۔ اور شام و فلسطین کے کلیساؤں کو برباد کر دے گا۔

سنہ ۶۲۲ء میں مدینہ میں مسجد کی معمولی ابتداء سے لے کر کوفہ، فسطاط، اور بیت المقدس کی ترقیوں سے گزرتے ہوئے نو سال بعد دمشق میں مکمل جامع مسجد کی تعمیر کا ارتقا دکھانے کی جو کوشش کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ضروریات کے متوازن اور متناسب تعمیری اظہار کو مرتب کرنے کے لئے تین پشتیں درکار ہوئیں۔ یہ ضروریات تین قسم کی تھیں، طبعی، مذہبی، اور سیاسی۔ طبعی ضروریات کو ایک گوشۂ عافیت، مسقف حرم، اور ہر سمت سے اس تک پہنچنے کے لئے مسقف راستے مہیّا کر کے پورا کیا گیا۔ مذہبی ضروریات کو اذان کے لئے مینار، وضو کے لئے حوض، حرم میں سمت نماز کے لئے ایک محراب، خطبہ کے لئے ایک منبر مہیّا کر کے پورا کیا گیا۔ سیاسی ضروریات کے لئے نقشہ کے شکوہ اور تناسب، اور تزئین و آرائش کی تابناکی سے کام لیا گیا۔ تاکہ اس کو زیر شدہ بازنطینی سلطنت کے صوبوں میں مفتوحہ نصرانی تمدن کے فن تعمیر کا حریف

---

[۵] اسلامی فن تعمیر، مصنفہ ج۔ ٹ۔ ریویریا، ص ۱۰۴۔

اور اگر ممکن ہو تو اس سے بڑھ چڑھ کر بنایا جائے۔ اس طرح یہ بات سب پر واضح ہو جائے کہ دنیا کا سب سے بلند اور سب سے عظیم المرتبت مقام اسلام کے قائدوں اور پیروؤں نے لے لیا ہے۔

یہ مقاصد حاصل کر لئے گئے، اور ان کے حصول میں ایک طرف فاتح قوم کے تدبر، اور قوت عمل سے کام لیا گیا جس میں ایک جوشش و خروش شامل تھا، اور جو اپنی اصل اور اپنی گہرائی کے لحاظ سے مذہبی تھا؛ اور دوسری طرف مفتوحہ اور بہت بڑی حد تک نومسلم قوموں کی فنی روایات اور مہارت سے بھی کام لیا گیا۔

دُوسرا باب

قبتہ الصخرہ ــــ سامرہ اور ابو دلف

اسلام کی پہلی صدی کے دوران میں جامع مسجد کے نقشہ میں جو ارتقا ہوا اس کے بیان میں بہت بڑی حد تک تحریری بیانات پر اکتفا کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ مدینہ، کوفہ، اور فسطاط کی اولین عمارتوں میں سے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اور بیت المقدس میں عبدالملک کی عظیم الشان مسجد کے متعلق قبتہ الصخرہ (وہ بڑی زیارت گاہ جو اس کے اندر تعمیر کی گئی تھی) کو چھوڑ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں نقشہ کے عام خطوط کے سوا اصل کا کچھ باقی بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ میں قبتہ الصخرہ میں بہت سا ردّ و بدل ہوتا رہا ہے، اسے آگ سے، بے توجہی سے اور مرمت کی خیر اندیش کوششوں سے نقصان پہنچا ہے، تاہم اس کا نقشہ، اور اسی طرح اس کا ڈھانچہ اور اس کی تزئین و آرائش کا بہت بڑا حصہ عبدالملک کی اصل عمارت کا ہے جو ساتویں صدی کے ربع آخر میں بنائی گئی تھی۔ یہ اسلامی فن تعمیر کی قدیم ترین موجود یادگار ہے۔ اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر کے سلسلہ

میں — جس میں قبتہ الصخرہ سب سے اہم زیارت گاہ تھی —
دو آدمیوں کے ناموں کے سوا اور کچھ معلوم نہیں جو فنی اور
مصارفی ہدایت کے ذمہ دار تھے۔ ان میں ایک عرب عالم رجا
ابن حیا نامی اور دوسرا بیت المقدس کا ایک باشندہ یزید ابن
سلام تھا۔ غالباً یہ خیال کرنا درست ہوگا کہ فنی ہدایت بیت المقدس
کے باشندے کے ذمہ اور مصارفی ہدایت عرب عالم رجا ابن
حیا کے ذمہ تھی۔

تعمیرکار کے آگے صخرۂ مقدس پر اس کو احاطہ کرنے والی
موزوں عمارت بنانے اور محصورہ دیواروں کے اندر زائرین
کے طوافِ صخرہ کے لئے کافی جگہ چھوڑنے کا مسئلہ تھا۔ بہ شبہہ عمارت
کے ڈھانچے کے اس حصہ کو جسے چٹان کے ٹھیک اوپر بنانا تھا،
بلندی اور چھت کے لحاظ سے اولیں تعمیری اہمیت حاصل ہونی
چاہیئے تھی۔ اور زائرین کے طواف کے لئے محراب دار کم اہم چھتے
پر نسبتاً کم بلندی پر کم اہمیت کے ساتھ چھت ڈالا جاسکتا تھا ایس
یہ طے ہوا کہ چٹان پر ایک گنبد بنایا جائے، اسے مدور نقشے
کی زیریں عمارت پر قائم کیا جائے اور اس کا قطر اس سے زیادہ

سه قبتہ الصخرہ کے نقشہ کی اصل ؛ از ک ، الف ، س ، کرسوں - برطانوی
مدرسہ آثارِ قدیمہ بیت المقدس ، لندن ۱۹۲۴ء

ORIGIN OF THE PLAN OF THE DOME OF THE ROCK:

BY K.A.C. CRESWELL, BRITISH SCHOOL OF ARCHEOLOGY

IN JERUSALEM, LONDON, 1924.

نہ ہو جو چٹان کو آسانی کے ساتھ احاطہ نہ کرے۔ پہلے ہی سے شام اور فلسطین میں گنبد کی شکل مقدس مقامات کو پر شکوہ بنانے کے لئے روائتی تعمیری وضع کی حیثیت سے مروج تھی۔ محراب دار چھتوں کے لئے جو عرض درکار تھا، وہ ایک فصل پر محیط ہونے کے لئے بہت زیادہ تھا۔ اس کو مدور کمرے اور زیارت گاہ کی بیرونی دیوار کے درمیان ایک سہارا دینے والا چھتا بنا کر دو حصوں میں تقسیم کرنا ضروری تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ یہ چھتا اور بیرونی دیوار دونوں مثمن نقشے کے ہوں۔ اسی طرح کی ترتیب (ایک دائرہ میں جما ہوا مثمن) کنیسۂ صعود میں پائی جاتی تھی جو اس وقت جبل زیتون پر موجود تھا اور چوتھی صدی کے آخر میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کے سوا یہ ترتیب شام اور فلسطین کے اور مقامات میں بھی پائی جاتی تھی جیسے ۵۱۲ء میں تعمیر شدہ کلیسائے بوسرہ کنیسۂ صعود — جس کے آثار کو بیت المقدس کے عالم مملکتی راہبوں نے ڈھونڈ نکالا ہے — کا بیرونی مثمن تقریباً بالکل اسی حجم کا ہے جس حجم کا وسطی مثمن چٹان کے اطراف بنایا گیا ہے۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثمنی ڈھانچے میں بٹھائے ہوئے گنبد دار مدور کمرے کا تصور فلسطین کے معماروں میں اسلامی فتح سے چند صدیوں پہلے ہی سے موجود تھا۔ کپتان کرس ول[۵] نے حال میں اس بات

[۵] NOTE SAR LA METHODE.

EMPLOYEE POARTRACER LE PLAN DE LA MOSQUE D'OMAR ET DE LA ROTONDE DU ST. SEPULCHRE A JERUSALEM." REVWE ARCHEOLOGIQUE, iii^{e} SEV. Txii, P.P.14-24.

پر یقین کرنے کے بعض دلائل پیش کئے ہیں کہ کلیسائے بوسرہ اور قبتہ الصخرہ میں مثمن کے دائرہ کی حد تک تعلق پایا جاتا ہے۔ اس تعلق کا اظہار ان کے ایک ہی ہندسی طریقہ پر نقشہ میں بٹھانے سے ہوتا ہے۔ قبتہ الصخرہ کا نقشہ بٹھانے کا طریقہ کئی برس پہلے ماؤس (Mauss) نے دریافت کیا تھا[5]۔ مجھے قبتہ الصخرہ کے نقشہ کی پیمائش کا موقع ملا ہے۔ پیمائشوں نے ماؤس کے نظریہ کی تصدیق کر دی۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ اندرونی مثمن کے زاویے بڑھائے اور دو مربعوں کے ضلعوں سے ملا کر قائم کئے گئے ہیں جو درمیانی دائرہ میں اس طرح بٹھائے گئے ہیں کہ ان کے خطوط محور ۴۵° درجے کے زاویہ پر ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ بیرونی مثمن کی وضع بھی اسی طرح وسطی مثمن کے ضلعوں کو بڑھا کر قائم کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ (اس طرح دو ایک دوسرے کو قطع کرنے والے مربع بتاتے ہوئے) بیرونی مثمن کے اندرونی دائرہ سے (جن کا نصف قطر دونوں مربعوں کے وتر کے برابر ہے) مل کر اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر اس خیال کو معقول سمجھا جائے کہ ایک سو ستر سال قبل بوسرہ کے کلیسا کی تعمیر میں بھی یہ طریقہ استعمال کیا گیا تھا تو بھی یہ نتیجہ نکالنا کچھ ضروری نہیں کہ اسلامی زیارت گاہ

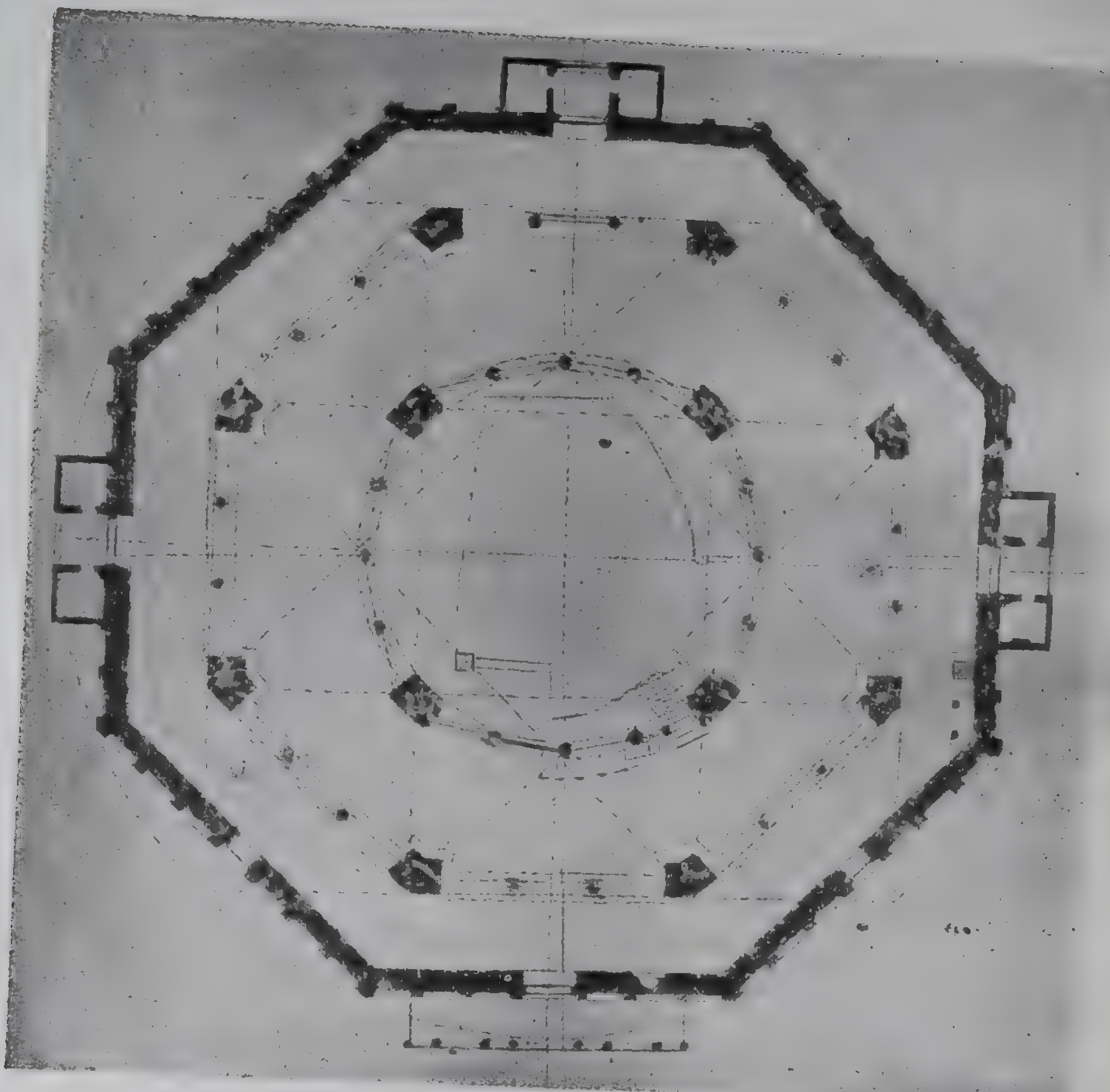
---

[5]۔ فرانسیسی ترجمہ از مادام دی کنزو؛

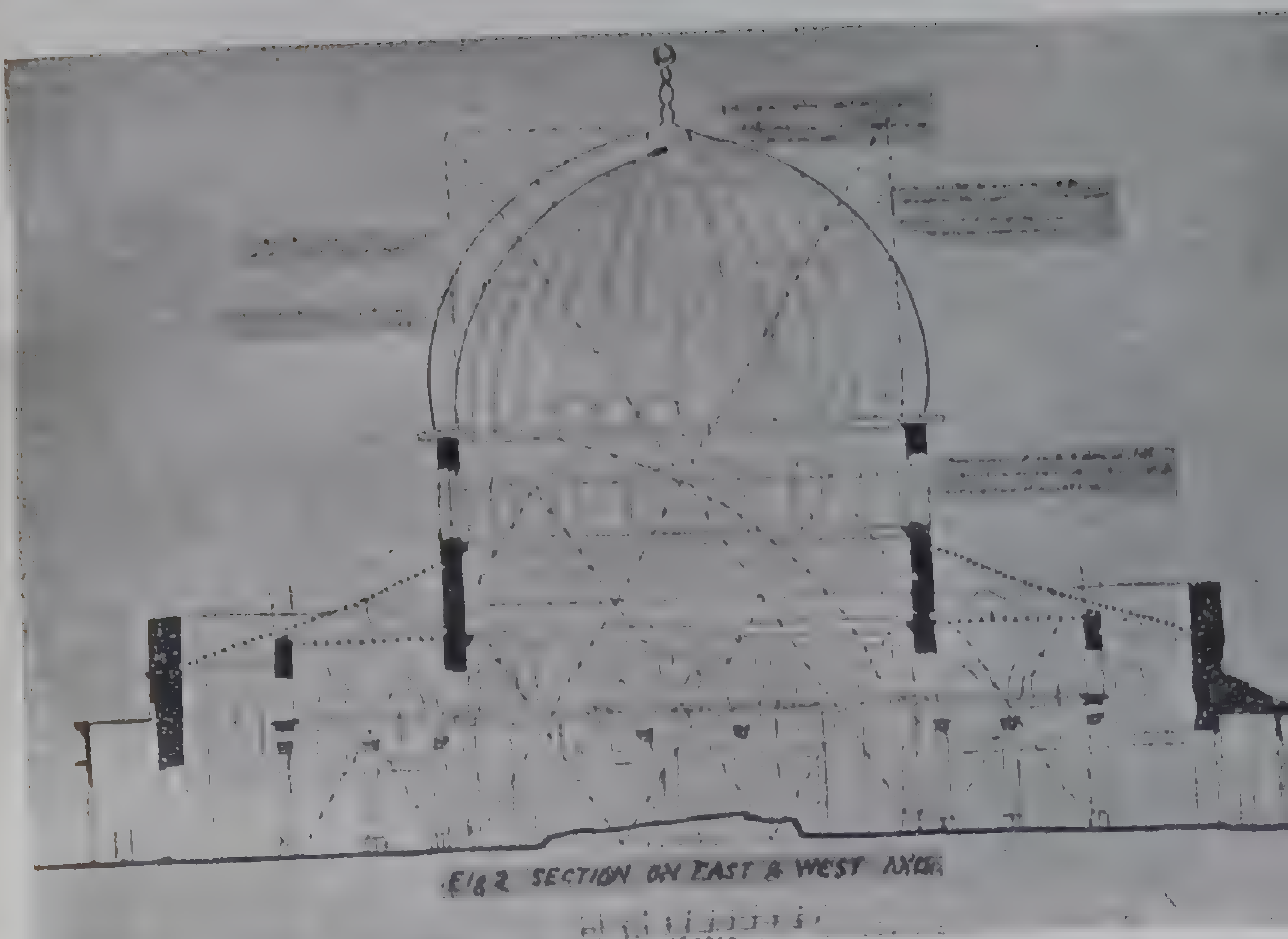
"It, Neraires Russes en Orient," P. 12;

See Translation of extract in G. Jeffrey.

"The Hoby Sepulchre": P. 22.



شکل نمبر ۵- قبۃ الصخرہ کا نقشہ



شکل نمبر ۶- قبۃالصخرہ کا تراشی نقشہ

کے تعمیر کار نے کلیسا کے نقشہ کی نقل اڑائی ہے۔ یہ زیادہ اغلب ہے کہ دونوں عمارتوں کے تعمیر کاروں کی ہدایت ایک ہی ہم آہنگ روایت نے کی ہے۔

ہندسی طریقہ صرف نقشہ کے بنانے ہی میں نہیں بلکہ بلندیوں کے متعیّن کرنے میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ پایوں اور ستونوں کی بلندی، جن میں مدور کمرہ واقع ہے، مدور کمرے کے آخری فرشی سطح سے گنبد کی حبت تک کی پیمائش کی ایک چوتھائی ہے۔ (شکل ۶) اور وہ سطح جس سے گنبد کو روشن کرنے والے دریچوں کی کمانوں کی حبت نکالی ہے، ایک ایسے مثلث کی راس پر واقع ہے جس کے اضلاع مدور کمرے کے محیط کے برابر ہیں، اور قاعدہ آخری فرشی سطح پر واقع ہے۔ گنبد کی بلندی اس مثلث سے دوگنی، اور مثمن کی بلندی اس سے دو تہائی ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ایسی ہندسی روایات (روایات جو شام میں مروج۔ نصرانی فن تعمیر کا جزو بن گئی تھیں) جنھوں نے اسلامی فتح سے قبل کی عمارتوں کی تعمیر میں شامی تعمیر کار کی ہدایت کی تھی، اسلامی فتح کے بعد دو پشتوں تک باقی رہیں۔ یہ خیال کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ایسی روایات اور بہت سی پشتوں تک باقی نہیں رہیں۔ فلسطین کے اسلامی فن تعمیر کی تاریخ کی یہ بدنصیبی ہے کہ قبتہ الصخرہ کی تعمیر (۶۶۷۸) اور دوسرے باقی ماندہ تعمیری کاموں کے درمیان ۵۰۰ سال کا ایک سپاٹ دور پڑتا ہے۔ بے شبہہ یہ خلا دسویں صدی میں

قرامطہ اور گیارھویں صدی کے اختتام پر ترکمانوں اور فرنگیوں (FRANKS) کی تاخت و تاراج اور حملوں اور اس کے بعد تقریباً دو صدیوں تک ملک کے بڑے حصّہ پر فرنگیوں کے قبضہ کا نتیجہ ہے۔

قبتہ الصخرہ کے مدور کمرے کا ڈھولنا چار پایوں اور بارہ ستونوں پر اٹھایا گیا ہے۔ ستونوں کو تین تین کی جوڑی بنا کر پایوں کے درمیان قائم کیا گیا ہے۔ بازنطینی فن تعمیر میں چھٹی صدی کے بعد سے ستونوں اور پایوں کے یک جا استعمال کا طریقہ مروج ہو گیا تھا۔ یہ طریقہ ایا صوفیہ میں پایا جاتا ہے۔ غالباً یہی طریقہ ضریح مقدس کے مدور کمرے میں بھی ابتداً استعمال کیا گیا تھا؛ اگرچہ ضریح کے مدور کمرے میں ستون اب دکھائی نہیں دیتے۔ ممکن ہے کہ یہ ستون بعض پایوں کی دیوار کے اندر اب بھی موجود ہوں، کیونکہ روسی پادری دانیال (RUSSIAN ABBOT — DANIEL) (بارھویں صدی کی ابتداء میں) گنبد کے سہاروں کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ چھ پایوں اور بارہ یک سنگی ستونوں پر مشتمل تھے۔[سه]

ستونوں کے استحکام میں اضافہ ہو جاتا ہے اگر ان کے اوپر یونانی فن تعمیر کی طرح چپٹے سر دل چڑھا دئیے جائیں۔ لیکن کمانوں کا حال متغیر سا ہے، اور ستونوں پر اور خاص کر ایک مدور نقشہ میں ان کا تعمیر کرنا ایک متغیر عنصر اور کمزوری کا اندیشہ پیدا کرتا ہے۔ اس خطرہ سے حفاظت کے لئے کچ پتھر کے ٹھوس

سه خلافت : از سر ولیم موئر ص ۳۹۵

THE CALIPHATE, BY SIR WILLIAM MUIR, P. 395.

پائے اختراع کئے گئے ہیں۔ اس طرح ڈھولنے کے لئے پایوں اور ستونوں کے سہارے مہیّا کرنے میں تعمیر کار ضریح مقدس یا کسی اور عمارت کی نقل نہیں کر رہا تھا۔ وہ وہی کر رہا تھا جس کا کرنا فنّی لحاظ سے ضروری تھا۔ اس کے سوا اگر وہ نقل کر رہا تھا تو اسے چار کی جگہ چھ پائے استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ اس خصوص میں وہ ضریح مقدس کے تعمیر کار سے زیادہ جری تھا۔ یہ چار پائے ان کمانوں سے جو پایوں پر بنائی گئی ہیں کہیں زیادہ دبیز ہیں۔ اور نتیجۃً کمانوں پہ بنی ہوئی ڈھولنے کی دیوار سے بھی دبیز ہیں۔ ڈھولنے کی دیوار کو مزید استحکام پایوں کو اپنے پورے عرض پر پھیلا کر بخشا گیا ہے۔ تاکہ وہ ڈھولنے کے لئے گھڑ گچ کا کام دیں اور باہر سے دکھائی دیں۔ (شکل ۷)

مدور کمرے اور درمیانی برآمدے کے یک سنگی مرمریں ستون سب کے سب قدیم عمارتوں یا ان کے کھنڈروں سے حاصل کئے گئے تھے۔ ان کے محیط مختلف ہیں اور ۶۴ سے لے کر ۸۵ سینٹی میٹر تک کے پائے جاتے ہیں۔ ان کے سرستون ہر جگہ دہروں کے مماثل نہیں ہیں۔ جو کچھ مسالہ مل سکتا تھا، تعمیر کار نے اس کو بہترین طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ جو کچھ مہیا کیا جا سکتا تھا ان میں سرستون اور دھرے سب سے زیادہ شان دار تھے۔ اور اگر انھیں تیار کیا جاتا تو ان پر بہت زیادہ خرچ آتا۔ اگر ستونوں میں یکسانی پیدا کرنے اور دھروں اور سرستون کو پوری طرح بٹھانے کے لئے انھیں بدلا جاتا

تو ایسی صورت میں محنت کو بچانے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔پورا وسطی مثمن چھتا جوڑ سے مربوط ہے ، اور یہ جوڑ زبردست چوبی شہتیروں پر مشتمل سرستون کے اوپر کمانوں کی حبت کی ہم سطح لگائی گئی ہے ۔ اس جوڑ کے اوپر اور کمانوں کے درمیان گھڑے ہوئے پتھر کی چنائی کی گئی ہے جو تقریباً ایک فٹ عمیق ہے ۔لیکن اس کا مقصد زمین کے جھکاؤ کی معیاری حرکت کے مقابلہ میں عمارت کو مزید استحکام دینا تھا۔(شکل ۸)

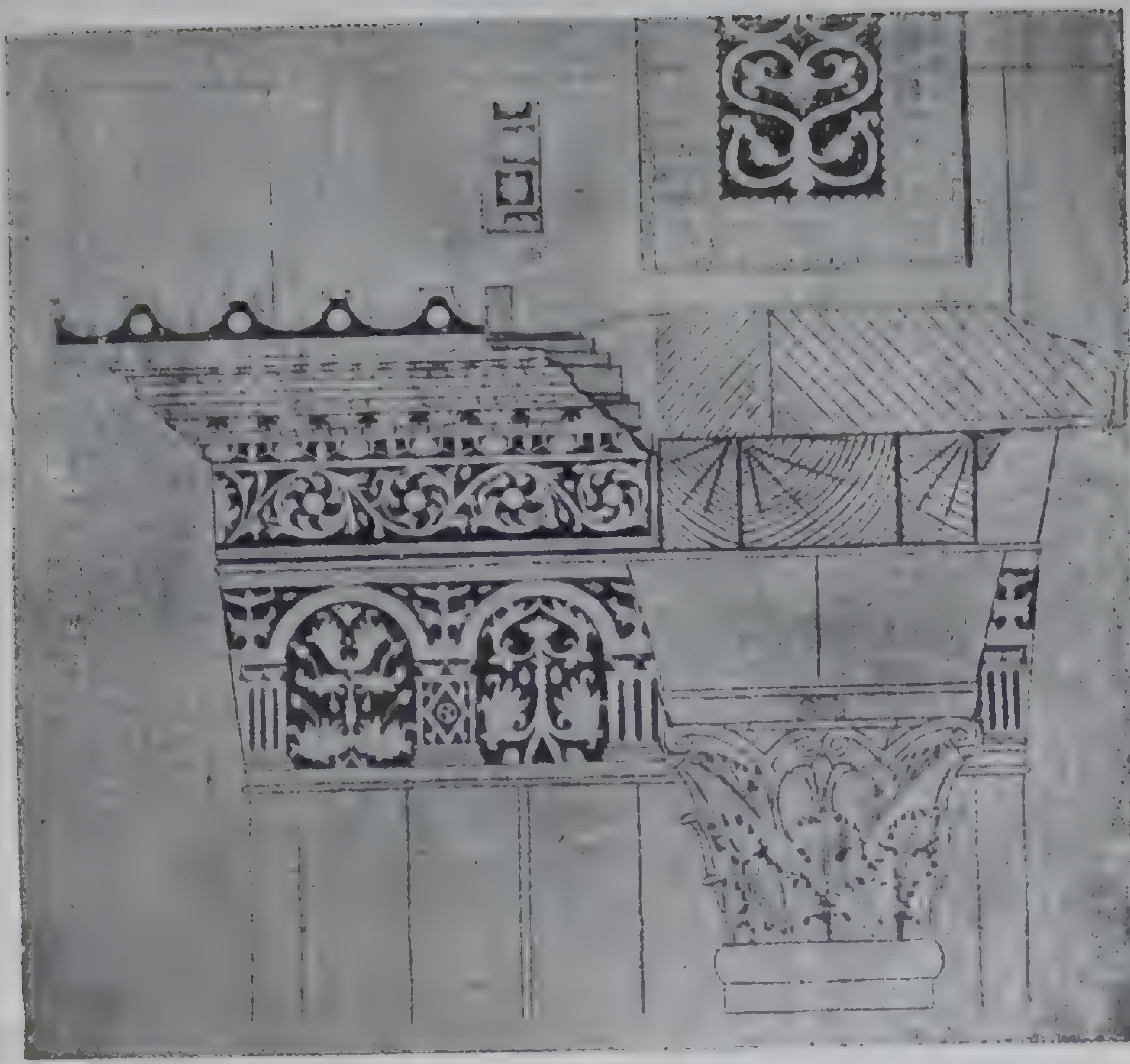
بیرونی مثمن کی دیوار گچ اور پتھر کے مربعوں کی بنی ہوئی ہے اور نہایت مضبوط ہے۔ یہ کوئی چار فیٹ سے زیادہ موٹی ہے۔ اس میں چار در ہیں جن کے رخ چاروں سمتوں میں واقع ہیں۔ ہر در پر لداؤ قوسی چھت کی ڈیوڑھی ستونوں پر بنائی گئی ہے۔مثمن کی دیوار چھتیس اور ڈھولنے میں سولہ گول سر والے دریچے ہیں۔

یہ تعمیری عناصر جو ابھی بیان ہوئے سب کے سب عبدالملک کے عہد کے ہیں۔

سنہ ۱۰۱۶ء میں اصلی گنبد زلزلوں کی وجہ سے گر پڑا ۔ موجودہ گنبد میں بعض کتبہ دار چوبی شہتیر ہیں جن پر کوفی خط میں سنہ ۱۰۲۹ء کی دوسری تعمیر کا حال کندہ ہے۔گنبد کے اکثر چوبی شہتیر بعد کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ چوبی چھتیں اور بھی زمانہ حال کی معلوم ہوتی ہیں اور گذشتہ ترکی عہد کی ہیں۔



شکل نمبر ۷- قبۃالصخرہ- شمال و مغرب کی طرف سے



شکل نمبر ۸- قبۃالصخرہ کے وسطی چھتے کا چوبی جوڑ

عمارت میں دو گنبد ہیں (شکل ۶) جو ایک دوسرے میں بٹھائے گئے ہیں۔ ہر گنبد میں بتیس ۳۲ پسلیاں ہیں۔ اور ہر گنبد رفتی ثقفی شہتیروں کے ذریعہ تین حصّوں میں تقسیم کر کے بنایا گیا ہے بیرونی گنبد کے آخری حصّے میں آڑہی پسلیاں دی گئی ہیں۔ بیرونی گنبد کی پسلیاں بیرونی رخ پر اور اندرونی گنبد کی پسلیاں اندرونی رخ پر کیلوں سے بٹھائی گئی ہیں۔ بیرونی گنبد پر سیسہ چڑھایا گیا ہے۔ اور اندرونی گنبد بیل بوٹوں اور کتبوں سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ بیل بوٹے اور کتبے استر کاری میں بنائے گئے ہیں اور ان پر ملمع اور رنگ کاری کی گئی ہے۔

تعمیر کے لحاظ سے دونوں گنبد ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ایک ایسا چوبی گنبد جس کے اندر تختے لگے ہوئے ہوں اور استر کاری کی گئی ہو، اور اُس کے بیرونی طرف سیسہ چڑھا ہوا ہو، اور جو زود متغیر حرارت کے زیر اثر پھیلتا اور سکڑتا ہو، اس میں یہ لط و کشاد استر کاری کی تزئین و آرائش میں تڑک پیدا کر دیتی اور گر پڑتی۔ لیکن اندرونی گنبد کی حفاظت کے لئے بیرونی گنبد کا اضافہ کرنے سے گرم فضا کا ایک ایسا گوشۂ پیدا ہو گیا جس کی حرارت سال بھر تک تقریباً مستقل رہتی ہے۔ اس گوشہ نے اندرونی گنبد کی حرارت کو ہموار رکھا، اس طرح اندرونی گنبد کی تزئین و آرائش کو نہ صرف بستہ و کشاد کے تباہ کن حرکات سے بلکہ انجماد کے اتنے ہی تباہ کن

اثرات سے بچا لیا۔ یہ تباہ کن انجماد سرما کے مہینوں میں اندرونی گنبد کی سرد سطح پر چڑھتی ہوئی رطوبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

گنبد کا ڈھولنا اور وسطی مثمن کی کمانیں شیشے کی پچی کاری سے مزین کی گئی ہیں۔ پچی کاری میں سنہرے، خاکی، سیاہ، نیلے گہرے اور ہلکے سبز ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ نقشہ گل بوٹوں کا ہے اور رسمی انداز کا ہے۔ حاشیہ میں سیاہ ٹکڑے لگائے گئے ہیں اور اس کے اہم خطوط سیپ کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے اجاگر کئے گئے ہیں۔ عقبی زمین سنہری ٹکڑوں کی ہے جو چینائی کے باقاعدہ دوروں میں بٹھائے گئے ہیں۔ ہر دور عموری نہیں بلکہ جھکا ہوا ہے تاکہ تراش میں کئی دور مل کر ایک پیچ دخم کھاتا ہوا خط بنائیں۔

مثمنی دیوار کی اندرونی سطح اور مدور کمرے کے چار دں پایوں کی سطح بازنطینی طرز میں کٹی اور بٹھائی ہوئی سنگ مرمر کی سلوں سے پاٹی گئی ہے اور مرمر کی دھاریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک ستون میں پائے اور کنگنی کے درمیان جو اطالوی سنگ مرمر لگا ہوا ہے، اور دسویں صدی کے آخر کا ہے، مثمن کی اندرونی سطح کا بیشتر مرمریں استر اصل عمارت کا معلوم ہوتا ہے۔ رنگین دریچے مرمریں استر کے ہم سطح نکالے گئے ہیں۔ یہ دریچے اصلی نہیں ہیں۔ اصلی دریچوں میں دیوار سے لے کر کواڑ تک کی اندرونی سطح تین فیٹ عمیق تھی، اور یہ سطح مرمر کی سلون سے پاٹی گئی تھی۔ اصل دریچے چھ انچ دبیز تھے، اور غالباً

جالی دار مرمر کی سلوں سے بند کئے گئے تھے۔ موجودہ دریچوں میں گچ کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ان میں رنگین شیشے جما دئے گئے ہیں۔ یہ دریچے مختلف زمانوں کے ہیں۔ سب سے قدیم دریچے ڈھونے کی دیوار میں ہیں، مثمن میں کوئی دریچہ پندرھویں صدی کے وسط سے پہلے کا نہیں، بعض دریچے اٹھارویں کے ربع آخر کے ہیں اور بعض انیسویں صدی اور چند ایک بیسویں صدی کے ہیں۔ خواہ یہ کسی زمانے کے ہوں، ان دریچوں کی تعمیر کا طریقہ یکساں ہے۔ یہ اسلامی فن تعمیر کے ساتھ ایسے مخصوص ہیں کہ ان کی تعمیر کے طریقہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دینا مناسب ہے۔ لکڑی کا چوکھٹا گچ پتھر کی دیواریں نکالی ہوئی جگہ میں بٹھانے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ پھر اس چوکھٹے کو کسی ہموار سطح پر جیسے میز یا سنگ مرمر کی سل پر لٹا دیا جاتا ہے۔ گچ یا مٹی کا رقیق استر چوکھٹے کے پورے عمق میں اور اس سے گھرے ہوئے رقبہ پر ڈالا جاتا ہے اور اسے جما دیا جاتا ہے جمنے میں استر پھیلتا ہے، اور اس لئے جب جم جاتا ہے تو اس کی سل چوبی چوکھٹے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیتی ہے۔ جب استر سخت ہو جاتا ہے تو اس کی سطح پر سفوف چھڑک کر نقش و نگار کا خاکہ بنایا جاتا ہے اور کھود کر جالیاں بنالی جاتی ہیں۔ نقش و نگار استر سے بنائے جاتے ہیں اور اسے کاٹا نہیں جاتا کھلی ہوئی جگہوں کو پاٹنے کے لئے رنگین شیشوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور انھیں سریش سے جما دیا جاتا ہے۔ سولھویں صدی کے دریچوں میں منبت کاری کے دوران میں برمے کے ذریعہ چھوٹی سرنگیں بنائی گئی ہیں۔ یہ سرنگیں سوا تین انچ کے قریب

گہری ہیں۔ ان کے اندرونی سروں کی بہ نسبت بیرونی سرے زیادہ چوڑے ہیں۔ اس لئے وہ قدرے نیچے کی طرف نشیبی ڈھکنا سا بنا لیتے ہیں۔ جب روشنی شیشہ سے گزرتی ہے تو استرکاری کی ان چھوٹی سرنگوں کی سطح شیشہ کے رنگ کی جھلک دینے لگتی ہے۔ رنگوں میں سرخ، نیلا، سبز، زرد، اور سفید رنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ سولھویں صدی کے دریچوں میں اندرونی سطح دریچے کے پورے رقبہ کی ہم سطح نہیں ہے بلکہ اس میں دو نقشے ہیں۔ ایک نقشہ دوسرے نقشہ سے ذرا اوپر کو اُٹھا ہوا ہوتا ہے۔ خاکے کے اہم خطوط اوپر کے نقشے میں اور ذیلی خطوط نچلے نقشے میں ہوتے ہیں۔ ابتدائی دریچوں میں دریچہ کے خانے بعد کے دریچوں کے خانوں سے بڑے ہیں۔ اور استرکاری کے خطوط (ہمارے دریچوں میں شیشہ جو کام دیتا ہے یہ وہی کام انجام دیتے ہیں) مشکل سے آدھ انچ چوڑے ہیں۔ شیشہ استرکاری کی بیرونی سطح سے تقریباً ساڑھے تین انچ کے فاصلہ پر بٹھایا گیا ہے اور اسے اپنی جگہ پر رکھنے کے لئے اندر کی طرف ہر کنارے پر آدھ انچ چوڑے اور آدھ انچ گہرے استرکاری کے گنیائی جیب ہوتے ہیں۔ یہ جیب شیشہ کے خانوں کی درمیانی جوڑوں کو ڈھانک لیتا ہے۔ شکل ۹ میں اسی قسم کا ایک دریچہ دکھایا گیا ہے۔

خاکے ہندسی نمونوں یا مختلف رنگوں کے گل بوٹوں کے گتھے ہوئے طغروں پر مشتمل ہیں۔

قبتہ الصخرہ کی اندرونی تزئین جو پچی کاری، تصویر کاری، اور رنگین شیشوں کے دریچوں سے منور مرمر کے ذریعہ کی گئی



شکل نمبر ۹- استرکاری میں بٹھائے ہوئے رنگین شیشوں کا ایک دریچہ،

ہے، ایک شاندار اور عمدہ اثر پیدا کرتی ہے، اور اس دل کشی و عظمت میں جو عمارت پر چھائی ہوئی ہے شکوہ کا اضافہ کرتی ہے، اور جو بھی اندر داخل ہو اس کو متاثر کرتی ہے۔

باہر سے یہ زیارت گاہ اتنی متاثر نہیں کرتی جتنی کہ اندرونی طور پر کرتی ہے۔ اگرچہ عمارت کا ڈھانچہ اس اٹھے ہوئے چبوترے پر جس پر وہ بنایا گیا ہے اطمینان بخش استواری کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے، تاہم مثمن اور مرکزی مدور کمرے کا آپس میں رشتہ اور انھیں ایک حاصل ہونے والی اہمیت باہر کی طرف اتنی واضح نہیں جتنی کہ اندر کی طرف سے واضح دکھائی دیتی ہے۔

گنبد کا ڈھولنا اندر کی طرف اس قسم کے روغنی گلی ٹائیلوں[٥] سے مزین کیا گیا ہے جنھیں عام طور پر ایرانی — کاشی کاری — کہا جاتا ہے۔ مثمن کی دیواریں فرش سے لے کر دریچوں کی دہلیز سے کسی قدر نیچے کی سطح تک مرمر کی سلوں سے پٹی ہوئی ہیں۔

---

٥ اُردو میں TILE کا مترادف کوئی لفظ موجود نہیں۔ اہل ایران ایسے کام کو کاشان کی نسبت سے کاشی کاری کہتے ہیں۔ لیکن ٹائیل TILE کے لئے خود ان کے پاس بھی کوئی لفظ موجود نہیں۔ انجمن ترقی اُردو نے اس لفظ کے لئے متعدد الفاظ پیش کئے ہیں ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو ٹائیل کے پورے مفہوم کو ادا کرے عربی میں قرمید اور طوب کے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں لیکن ٹائیل کی بہ نسبت یہ الفاظ اردو دانوں کے لئے زیادہ نامانوس ہیں۔ اس لئے ٹائیل کے لئے ٹائیل اور TILE WORK کے لئے کاشی کاری کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

اور اس سطح سے آگے ٹائیلن استعمال کی گئی ہیں۔ مرمر کی چند سلیں اور کسی حد تک ان کے جمانے کا انداز عبدالملک کے عہد کا ہوگا لیکن بیشتر بلکہ تمام تر مرمر اتنی دفعہ جمایا گیا ہے اور گرے ہوئے ٹکڑوں کی جگہ نئے ٹکڑے لگائے گئے ہیں کہ موجودہ ترتیب پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اصل خاکے کی باوثوق شہادت پیش کرتی ہے۔ تزئین کا اصل طریقہ مرمر کی سطح بندی کے اوپر پچی کاری کا تھا۔ ٹائیلوں کے ذریعہ تزئین کے موجودہ طریقہ نے غالباً پندرھویں صدی کی ابتدار اور یقیناً سلیمان اعظم اور اس کے جانشین سلیم سے بہت پہلے پچی کاری کی جگہ لے لی۔ قبتہ الصخرہ کی دیواروں پر ایسے ٹائیل پائے جاتے ہیں جو پندرھویں صدی سے بیسویں صدی تک ہر صدی کے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان سب کا مجموعہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ لیکن ان کی موجودہ نشستیں اور ان کو بٹھانے کی طرز بہت ہی محدود پیمانے پر اپنے اصلی خاکے پر ہے۔ کیونکہ سرما کے طوفانوں، ناکافی نگرانی اور غیر واقف کارانہ مرمت نے ان میں بڑی تباہی پھیلائی ہے۔ تاہم اس طرح کی افراتفری کے باوجود کم سے کم ان اہم اصولوں کو متعین کرنا ممکن ہے، جنھوں نے اصل خاکہ بنانے والوں کی راہ نمائی کی تھی۔ خاکے کے اہم عناصر قرآنی کتبات تھے، اور ہندسی اور نباتی نمونوں کو اس ترتیب سے جمایا گیا تھا کہ وہ مقدس عبارتوں کے لئے زیادہ سے زیادہ شاندار نشست مہیا کریں۔ اس طرح یہ سب بحیثیت مجموعی اہم تعمیری خطوط سے ہم آہنگ ہو جائیں اور پایے، کنگنی اور

دروازوں اور دریچوں کے موکھوں جیسی چیزوں کو مزین اور نمایاں کریں۔

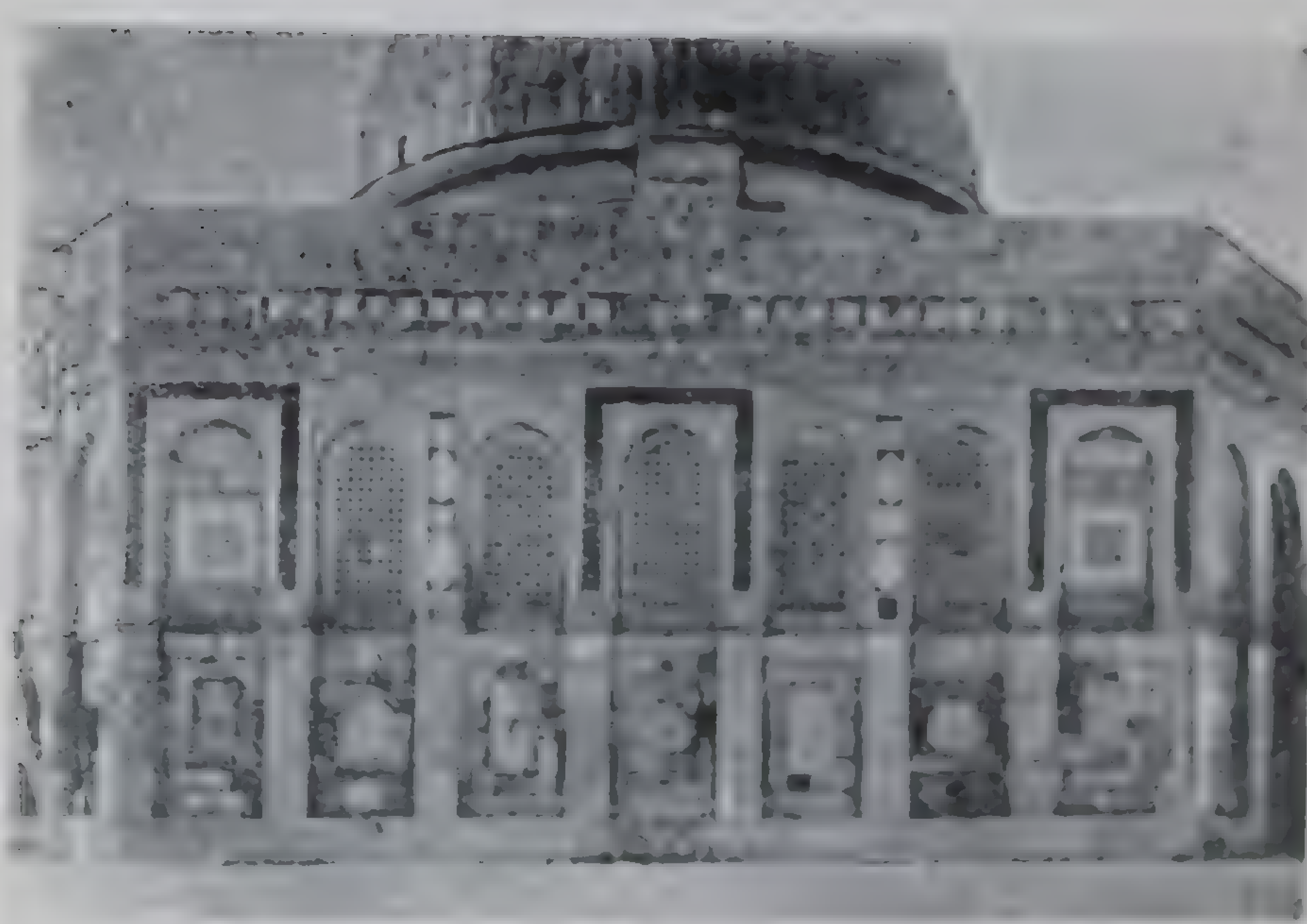
سب سے اونچے یعنی سب سے زیادہ محترم مقامات اہم کتبات کے لئے مختص تھے۔ تزئین کے لئے قابل حصول جگہوں میں سب سے بلند سطح گنبد کی چھت ہے جہاں سے گنبد کی حبت شروع ہوتی ہے۔ یہاں خاکہ کاروں نے ڈھولنے کو گھیرنے کے لئے ایک بڑا کتبہ نصب کیا تھا۔ یہ کتبہ بڑی حد تک ٹائیلوں کا اثر پیدا کرتا ہے، لیکن ٹائیلوں کا نہیں بلکہ ایسی پچی کاری میں بنا ہوا ہے جس کے ٹکڑے روغنی مٹی کے ہیں اور انھیں حروف اور بناتی طغروں کی شکل میں کاٹا گیا ہے جو حروف کے لئے عقبی زمین مہیا کرتے ہیں۔ اس کتبہ میں سورہ و اللیل کی ابتدائی آیتیں درج ہیں۔ یہ واقعہ کہ کتبہ ایک آیت کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا تسلسل کہیں اور باقی رکھا گیا تھا۔ اس کتبہ کے دونوں بازوؤں پر ایک حاشیہ ہے جس میں مسلسل ہندسی نمونے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ان سے بناتی خاکوں سے بھری متعدد کشتیاں بنتی ہیں۔ حاشیے میناکار ٹائیلوں کے ہیں اور بہت بڑی حد تک ان ٹائیلوں پر مشتمل معلوم ہوتے ہیں جو کتبہ کے ہم عہد ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چوبی تزئین کے اوّلیں دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

حاشیے کا یہی نمونہ دریچوں کے موکھوں کے گرد لگایا گیا تھا، اور دریچے کے موکھوں کی درمیانی ہر ایک کشتی زمانہ حال کی طرح

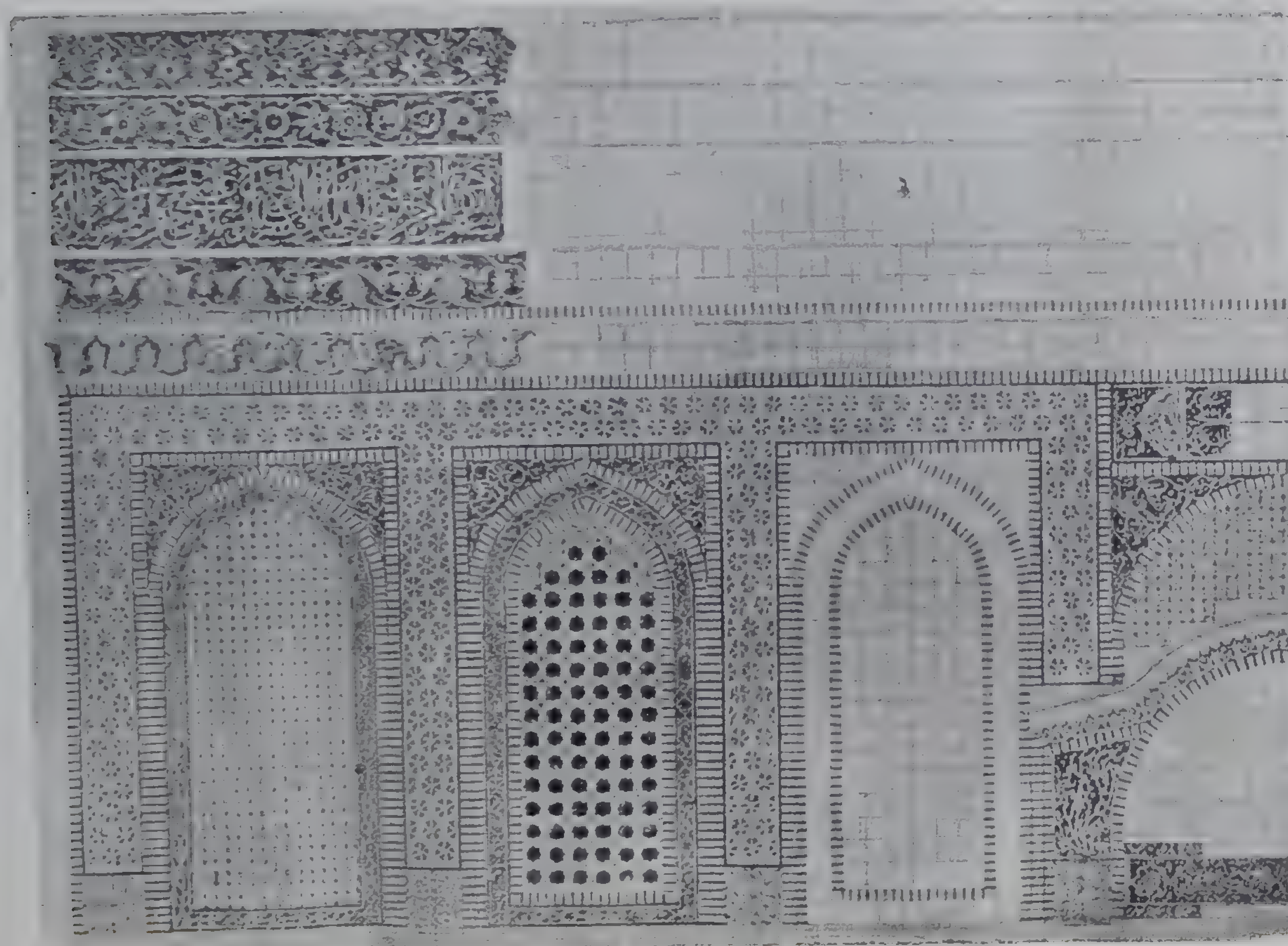
مختلف خاکوں کے معجون مرکب سے ملوّنہ تھی، بلکہ اس پر صرف ایک ہی خاکہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ خاکہ رنگ کے لحاظ سے اتنا ہی شان دار تھا جتنا کہ ایرانی قالین شان دار ہوتا ہے۔ شکل ۱۰ میں بہ حالت موجودہ ڈھولنے کی تزئین کا ایک حصّہ دکھایا گیا ہے۔ مثمن پر بھی سب سے بلند مقام ایک قرآنی کتبہ کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ موجودہ کتبہ سورہ یٰسین پر مشتمل ہے، اور اس میں انیسویں صدی کے ربع آخر کے ٹائیل لگے ہوئے ہیں۔ یہ اغلب ہے کہ اصل ڈھولنے پر شروع ہونے والا سورہ مثمن پر مکمل کیا گیا تھا۔ ادھر ڈھولنے کا کتبہ تو کنگنی کے ذریعہ موسم کی دست بُرد سے اچھی طرح محفوظ کیا گیا، لیکن مثمن پر حفاظت کا کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا۔ سلیمان اعظم نے جب سولھویں صدی میں اس کی مرمت کرائی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثمن کا کتبہ اتنی خراب حالت کو پہنچ چکا تھا کہ اس کا پڑھنا تک ممکن نہ تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مرمت کرنے والوں نے ڈھولنے پر کے واللیل کے کتبہ کا نامکمل ہونا دریافت کیا اور نہ انھیں مثمن کے گرد اسے مکمل کرنے کا خیال آیا۔ بہر حال یہ ہو سکتا ہے کہ مثمن کے گرد سورہ یٰسین سلیمان اعظم کے زمانہ میں لگایا گیا ہو۔ سلیمان اعظم کے کتبہ کا جو کچھ حصّہ باقی رہ گیا ہے اسے جمع کر کے مسجد کے جنوب مغربی گوشے میں ایک عجائب خانے میں رکھا گیا ہے۔ مثمن کی منڈیر پر کے کتبے کے گرد بھی ڈھولنے کے اطراف کے کتبہ کی طرح حاشیے دئے گئے تھے۔ یہ حاشیے روایتی نباتی



شکل نمبر ۱۰۔ قبۃ الصخرۃ کے تمولئے کے اطراف جوکی آرائش کا
ایک حصہ۔



شکل نمبر ۱۱۔ قبۃ الصخرۃ۔ مثمن کا شمالی مغربی رخ



شکل نمبر ۱۲- قبۃالصخرہ کا شمالی رخ- چوکی تزئین کی دوبارہ قیاسی تعمیر

طغروں کے تھے اور کتبہ کے ساتھ بے خلل مثمن کے گرد چلے گئے تھے منڈیر کے نیچے کی کنگنی ایسے نمونے سے مزین کی گئی تھی جو اس کے گرداگرد چلا گیا تھا۔

شکل ۱۱۰ میں موجودہ حالت میں مثمن کا ایک رخ دکھایا گیا ہے کنگنی اور دریچوں کے نیچے مرمریں چوکھٹے کی درمیانی جگہ میں دریچوں کی درمیانی دیوار میں پائے دئے گئے ہیں۔ اور ان پر گول سری کمانیں اٹھائی گئی ہیں۔ جہاں ٹائیل کا آرائشی کام کیا گیا ہے وہاں گول سری کمانیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی بجائے نکیلی کمانیں استعمال کی گئی ہیں، اور یہ اس صورت کی ہیں جنھیں اکثر ایرانی کہا جاتا ہے۔ نکیلی کمانیں ایک مثلثی چوکھٹے میں بٹھائی گئی ہیں جو پایوں اور مرغولے سے بنایا گیا ہے۔ دریچے کے موکھے کے بیرونی کنارے پر بٹھائے ہوئے سوراخ دار ٹائیل کے جنگلے اندرونی شیشہ اور استری دریچوں —— ان کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے —— کی موسم سے حفاظت کرتے ہیں، اور اندرونی دریچوں تک پہنچنے سے پہلے ہی بارش کی پچھاڑ کا زور توڑ دیتے ہیں۔ پایے، مرغول کنگنی، دریچوں کے موکھوں اور کمانوں کی بیرونی حد بندی وغیرہ اینٹوں سے کی گئی ہے۔ ان اہم عناصر کو مصور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مثمن کی کاشانی آرائش پر محتوی تھے۔ ابتداً پندرھویں صدی میں جب اس وقت کے مروجہ میناکار ٹائیلوں سے قبتہ الصخرہ کو مزین کیا گیا ہوگا تو وہ نہایت حیرت ناک طور پر شاندار دکھائی دیتا ہوگا۔ سولھویں صدی سلیمان اعظم نے جو

مرمت کرائی اس میں مقابلتاً نہایت ہلکے رنگ کے ٹائیل استعمال کئے گئے ہیں۔

قبتہ الصخرہ کی زیارت گاہ اگرچہ اسلامی مقاصد کے لئے تعمیر ہوئی، لیکن اسے واضح طور پر نصرانی صناعی کی پیداوار سمجھنا چاہیئے۔ پندرھویں صدی میں اس کے ایرانی ملبوس میں آنے سے پہلے اس کا بیرونی منظر مرمر اور پچی کاری سے ڈھکا ہوا اتنا ہی بازن طینی وضع کا نظر آتا ہوگا جتنا کہ بہت بڑی حد تک آج بھی اس کا اندرونی منظر بازن طینی نظر آتا ہے۔ روغنی یا مینا کار مٹی جس سے اب اس کی رُخ بندی کی گئی ہے ـــــ اور کسی قدر بے میل طریقہ پر رُخ بندی کی گئی ہے ـــــ ایک ایسی صناعی کی پیدا وار ہے جس نے شام جیسے پتھر اور پتھر کے معماروں کے ملک میں نہیں بلکہ ریگڑ یا چکنی مٹی اور اینٹ اور اینٹ کے معماروں کے ملک میں جنم لیا۔ قبتہ الصخرہ اس بڑھتی ہوئی آشنائی کی اچھی مثال پیش کرتا ہے جسے اسلام کے استحکام نے پتھر کی تعمیر کی روایتوں اور اینٹ کی تعمیر کی روایتوں اور ان کی ذیلی صنعتوں کے درمیان پیدا کر دی تھی۔ قبتہ الصخرہ ایک پتھر کی عمارت ہے جسے بیرونی طور پر خشتی تعمیر کی ایک ذیلی صنعت سے ڈھانک دیا گیا ہے۔

خشتی تعمیر کے ممالک جیسے مسوپٹیمیا یا ایران میں اسلامی فن تعمیر کی اتنی قدیم یادگار باقی نہیں ہے جتنی قدیم کہ بنی امیہ کے تحت فلسطین اور شام میں عمارتیں بنی ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد کی

تعمیری ترقیوں کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان واقعات کو دہرا دیا جائے جو بنی امیہ کے زوال اور بنی عباس کی حکومت کی ابتدا کا سبب بنے۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان جو رقابت چلی آرہی تھی اس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہ لوگ جن کا عقیدہ تھا کہ خلفاء کی جانشینی کا حق آنحضرت کے چچازاد بھائی علیؓ کی اولاد کے لئے مخصوص ہے، وہ شیعہ کہلائے۔ شیعی سازش نے اموی خلیفہ یزید ثانی (۷۲۰ — ۷۲۴) کے کمزور اور غیر مقبول دور حکومت میں زور پکڑا۔ اس وقت تک رسول اللہ صلعم کے چچا عباس کی اولاد نے خلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ان کی تجویزیں اب پہلی دفعہ سنائی دیتی ہیں۔ شیعہ یا جائز خلافت کے بارے میں اولاد علیؓ کے طرفدار اور بنی عباس ہی بنی امیہ کے دشمن نہ تھے۔ خلافت الٰہیہ کا حامی ایک فرقہ جو خوارج کہلاتا تھا، مسلسل بغاوتیں برپا کر رہا تھا۔ علوی، عباسی اور خارجی تینوں بنی امیہ کو رسول اللہ صلعم کا دشمن اور انھیں طاعون اور بدکاروں کی نسل سمجھتے تھے۔ علویوں کو تو بنی امیہ نے نہایت کامیابی کے ساتھ دبا دیا۔ ان کی ناکامی نے عباسیوں کو ایک خطرناک حریف سے نجات دلا دی۔ اب تک عباسیوں کے عزائم علویوں کے آگے ماند سے تھے، لیکن اب پورے بنی ہاشم کا مفاد صرف عباسیوں تک محدود ہو گیا

تھا۔[۵] آٹھویں صدی کے ربع اول کے اختتام کے قریب عباسی دعاۃ ہر طرف پھیل چکے تھے، اور مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی دعوت کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کی سازشیں اور ان کی دعوتیں کامیاب رہیں۔ بہت سے شہروں سے اموی فوجیں نکال دی گئیں۔ تحریک زور پکڑتی گئی، اور آخر کار سنہ ۷۵۰ء میں آخری اموی خلیفہ مروان نے ذاب اعلیٰ کی لڑائی میں عباسی فوجوں سے شکست کھائی۔ مصر تک مروان کا تعاقب کر کے اسے قتل کر دیا گیا، اس کے خاندان کا استیصال کر دیا گیا، اور اس کے بعد سے دمشق اسلامی دنیا کا صدر مقام باقی نہیں رہا۔

دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے سنہ ۷۶۲ء میں بغداد کی بنیاد ڈالی۔ موجودہ بغداد میں اس شہر کے کوئی آثار باقی نہیں۔ نہ ہی اب مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد (الف لیلہ کے بغداد) کا کوئی نشان ملتا ہے۔ اس شہر کو مغل ہلاکو نے سنہ ۱۲۵۸ء میں مکمل طور پر برباد کر دیا۔ کہیں بھی عباسیوں کے عہد کے فن تعمیر کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ نہ کوئی کھنڈر ایسا ہے جسے وثوق اور اعتماد کے ساتھ متوکل (۸۴۷ - ۸۶۱) کے عہد خلافت سے پہلے کا بتلایا جا سکے۔

---

[۵] اموراتھ تا انوراتھ۔ از مس گرٹرود بیل۔ ص ۱۳۷۔

"AMURATH TO ANURATH", BY MISS GERTRUDE BELL

P. 137

بنی امیہ کے تحت سب سے زبردست اثر شامی اثر تھا اور شامی سب سے بڑھ کر اس خاندان کے حامی اور مددگار تھے۔ اسلامی فن تعمیر کی اہم مثالیں بھی شامی تھیں۔ اور اپنی جداگانہ طرز کے ساتھ ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھیں جو بازن طینی سلطنت کے بحر روم کے صوبے کے لائق فنی روایات کے ساتھ وجود میں آئی تھیں۔

دوسری طرف بنی عباس کی حکومت میں سب سے اہم اثر ایرانی اور ایشیائی اثر تھا۔ ایران اور خراسان کی فوجوں ہی نے عباسیوں کو تخت خلافت دلایا، اور ابتدائی سالوں میں تخت حکومت انھیں کے پاس رہا۔ لیکن زیادہ مدت نہ گزری کہ عباسی خلفاء اپنے حفاظتی دستے جیحون کے اس پار رہنے والے ترکوں سے بھرتی کرنے لگے۔ ثقافتی امور میں ایرانی اثر سب سے ممتاز تھا۔ بغداد کے بانی ابو جعفر منصور کے عہد میں ایرانی لباس فیشن میں داخل تھا۔ مشرق کے علماء بڑے بڑے رتبوں پر فائز تھے۔ اسی عہد میں موبدوں نے دین اسلام قبول کیا اور ایرانی اور ہندوستانی علوم اور فلسفہ کو رواج دیا۔ اگر ہم عباسیوں کے شہروں کو جیسے بغداد، رقہ، اور سامرہ کو دوبارہ تعمیر کر سکیں تو ہمیں ایک اتنا ہی مشرقی اور ایشیائی طرز کا فن تعمیر نظر آئے گا جتنا کہ بنی امیہ کے تحت بیت المقدس اور دمشق کا فن تعمیر مغربی اور بازن طینی تھا۔ عہد عباسیہ کی ایسی باقیات جیسی سامرہ، رقہ، اور ابو دلف میں رہ گئی ہیں،

ایک ایسی طرز کی حامل ہیں جو بیت المقدس اور دمشق میں بنی امیہ کے کام سے بالکل ہی مختلف ہے۔

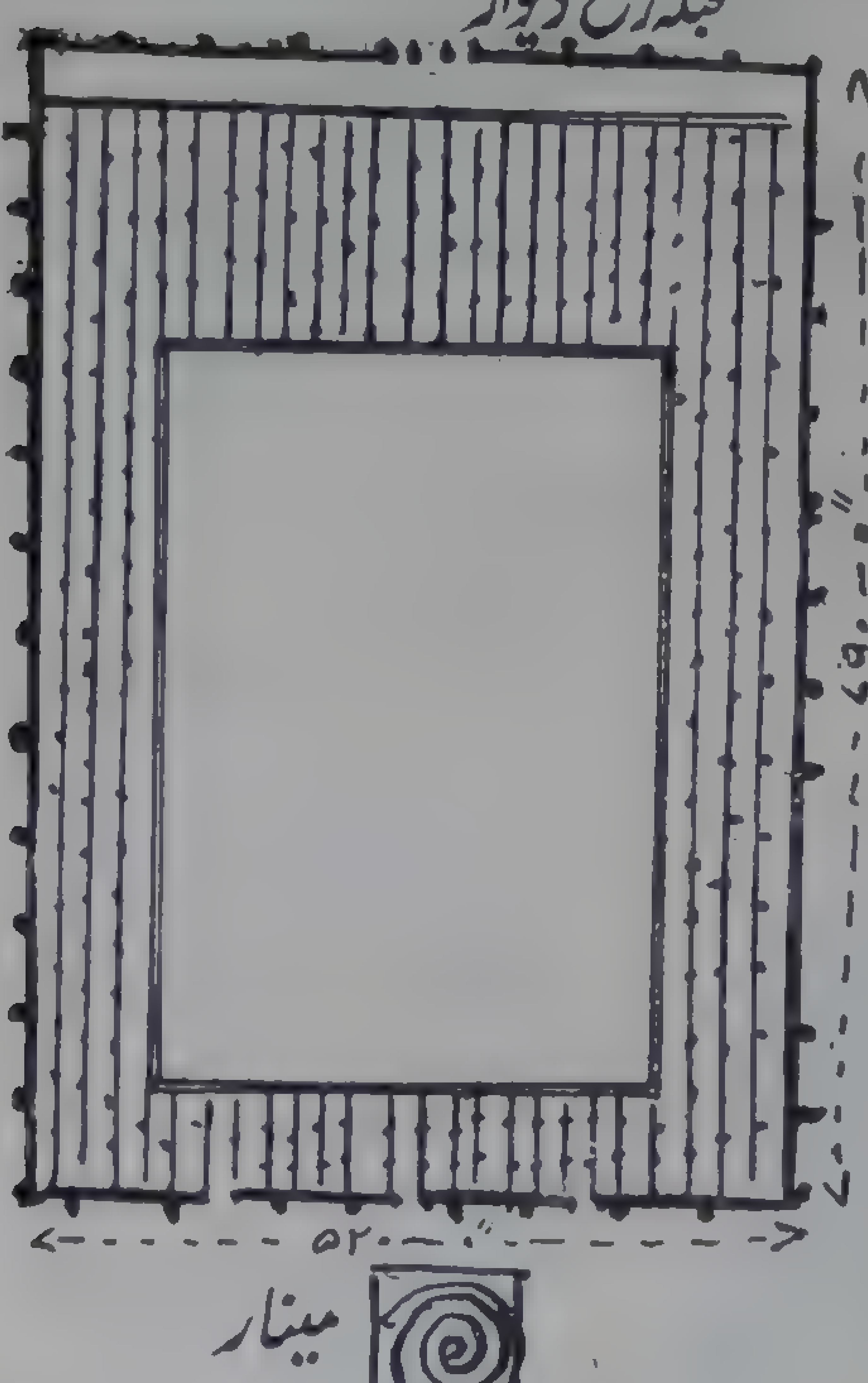
نویں صدی کے نصف اول میں خلیفہ معتصم نے سامرہ بسایا۔ اس کی وجہ یہ تھی اس کے ترکی حفاظتی دستے اہل بغداد کے لئے باعث زحمت تھے، اور خلیفہ کے لئے پریشان کن۔ چنانچہ خلیفہ نے انھیں سامرہ میں منتقل کر دیا۔ یہاں ان کے لئے خلیفہ نے بارکیں اور اپنے لئے محلات اور ایک مسجد بنوائی جو اب ناپید ہو گئی ہے۔ سامرہ دجلہ کے کنارے بغداد سے شمال میں ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سامرہ میں ایک بڑی مسجد کے موجودہ کھنڈر غالباً خلیفہ متوکل (۸۴۷ — ۸۶۱ء) کے عہد کے ہیں جو معتصم کی طرح اپنی ترکی فوجوں کو وہیں رکھتا تھا۔ سامرہ کی مسجد دمشق کی اموی جامع کبیر سے ایک سو چالیس سال بعد کی ہے۔ یہ ایک مستطیل احاطہ پر پھیلی ہوئی ہے جو ۷۸۷ فیٹ لانبا اور ۵۱۷ فیٹ چوڑا ہے۔ طول شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ احاطہ کی دیوار اینٹ کی بنائی گئی ہے۔ دیوار اور کولنوں پر گول برجیاں وقفہ وقفہ سے بنائی گئی ہیں۔ سمت نماز کے اظہار کے لئے جنوبی دیوار میں کوئی محراب نہیں۔ جہاں ہم اس کی توقع کر سکتے ہیں وہاں تین کمان دار موکھے ہیں۔ درمیانی موکھا باقی دو موکھوں سے بڑا ہے۔ (شکل ع۱۳) درمیانی موکھے کی اہمیت کو حاشیوں کے ذریعہ بڑھایا گیا ہے اور یہ حاشیہ اس کے اطراف چلا گیا ہے۔ اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کمان دار موکھے دروازے

ہوں گے۔ قبلہ رُخ دیوار میں ان کا محل وقوع دروازے کے لئے موزوں مقام نہیں، کیونکہ داخل ہونے والے لوگ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گذریں گے اور ان کی یکسوئی میں مخل ہوں گے۔ فان برچم کا بیان ہے کہ جب کبھی کوئی مسلمان مسجد سے باہر نماز پڑھتا ہے جہاں اسے بیرونی دنیا کے پراگندگی پیدا کرنے والے اثر سے علیحدہ کرنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی تو وہ بیرونی دنیا سے اپنی علیحدگی کے نشان کے طور پر اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لیتا ہے، یا زمین پر ایک خط کھینچ دیتا ہے تاکہ اپنے لئے وہ چیز مہیا کرلے جو "سترہ" یا حجاب کہلاتی ہے۔ اگر وہ اس احتیاط کے بغیر نماز پڑھے اور کوئی جانور اس کے آگے سے گذر جائے تو اس کی نماز متاثر ہو جائے گی۔ جب عرب سپہ سالار عقبہ نے قیروان میں اپنی نماز کی جگہ بنائی تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا نیزہ اپنے سترہ کے لئے کھڑا کر دیا۔ دیوار میں ایک کمان اور غالباً اس میں لٹکا ہوا قالین کیا اس مقصد کو پورا نہ کرتا ہوگا؟ نہ صرف یہ کہ مسجد سامرہ کی قبلہ رخ دیوار میں ان کمان دار موکھوں کا محل وقوع دروازوں کا محل وقوع نہیں معلوم ہوتا بلکہ انھیں اس طرح فصیل دار نہیں بنایا گیا ہے جیسا کہ شمالی، مشرقی اور مغربی موکھوں کو بنایا گیا ہے۔ اور یہ موکھے واضح طور پر دروازے کے موکھے ہیں۔ انھیں چوبی سردلوں کے ذریعہ اس طرح فصیل دار بنایا گیا ہے کہ مستطیل شکل کا

موکھا بنتا ہے اور کمان دار موکھوں کی بہ نسبت ایسے موکھوں میں کواڑ لگانا آسان ہے۔

احاطہ کی دیوار میں دریچوں کے موکھے بھی نکالے گئے ہیں۔ ان میں اپنے اندرونی رُخ پر پنج برگی کمانوں کے ذریعہ فصل دیا گیا ہے۔ احاطہ کے اندر مسجد بنائی گئی تھی۔ اس کا مسقف حرم احاطہ کے شمالی سرے پر واقع تھا۔ اور دو ایوان مغرب اور مشرق کی سمتوں سے حرم سے آملے تھے۔ وسط میں ایک کھلا صحن تھا۔ اس میں وضو کے لئے حوض بنایا گیا تھا۔ مقدسی بیان کرتا ہے مسجد کی چھت سنگ مرمر کے ستونوں پر اُٹھائی گئی تھی۔ یہ سب ستون اب غائب ہو گئے ہیں۔ یہ ستون یا تو دوسری عمارتوں میں استعمال کرنے یا جلاکر چونا بنانے کے لئے وہاں سے ہٹائے گئے ہیں۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ستونوں کے اوپر کمانیں بھی تھیں۔ اگر ستون کمانوں سے جوڑے جاتے تو کمانوں کے بعض نشانات اس جگہ ضرور باقی رہتے جہاں چھتے احاطہ کی دیوار سے مل جاتے ہیں۔ یہاں یا تو دیوار سے ان کی حبست کے آثار ملتے یا خشتی نیم ستونوں کے نشان مل جاتے۔ چونکہ وہاں ان دونوں کے بھی نشان موجود نہیں ہیں، اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چپٹے چوبی سردل ایک ستون سے دوسرے ستون تک چلے گئے تھے، اور یہ ایسی ترتیب تھی جو مدینہ اور کوفہ کی ابتدائی مسجدوں میں بھی استعمال کی گئی تھی۔

قیاس کیا گیا تھا کہ حرم میں ستونوں کی دس اور دالانوں میں چار قطاریں تھیں۔ ان قطاروں میں سے بہت سی قطاروں کا محل وقوع ان کی قطار بندی کی نشان دہی کرنے والی گہری نالیوں کے آثار کی وجہ سے تقریباً معلوم ہے۔ یہ قیاس کہ وہاں دس قطاریں ہوں گی جنوبی قطار کو قبلہ رخ دیوار سے بہت قریب کر دیتا ہے اور اس کے اور قبلہ رخ دیوار کا درمیانی فصل دوسری قطاروں کے درمیانی فصل سے کم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ زیادہ اغلب یہ ہے کہ یہ فصل کم ہونے کی بجائے زیادہ ہوگا تاکہ قبلہ رخ دیوار کے آگے زیادہ غیر منقطع فصل چھوڑا جائے جس میں نمازی اپنی صف بندی کر سکیں۔ لہٰذا اب یہ قیاس ہے کہ حرم میں ستونوں کی صرف نو قطاریں ہوں گی (شکل ۱۳ء) اور قبلہ رخ دیوار اور جنوبی قطار کے درمیان تقریباً تیس فیٹ کا فصل ہوگا



شکل ۱۲ء مسجد سامرہ کا قیاسی نقشہ

اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اس فصل پر چھت ڈالی گئی تھی۔ کیونکہ وہ سوراخ جن میں کڑیوں کے سرے ٹکائے گئے تھے اب

بھی جنوبی دیوار میں نظر آتے ہیں۔

احاطہ کی دیوار کے باہر اور اس کے شمال میں ایک مینار ایستادہ ہے۔ یہ چکر دار نقشہ پر بنائی ہوئی بد وضع اینٹوں کی ایک بہت بڑی عمارت ہے۔ (شکل ۱۴) اس کے ہرے پر چپٹے محرابوں کی شکل کا آرائشی کام ہے۔ بے شبہہ ابتدا، میں پوری عمارت سنگستر سے ڈھکی ہوئی تھی، اس میں غالباً نمونے بنائے گئے تھے، اور یہ نمونے یقیناً رنگین تھے۔

ابودلف کی ایک بڑی مسجد میں اصلی چھتہ سازی کا بہت بڑا حصّہ موجود ہے۔ یہ مسجد سامرہ کی مسجد کے بعد کے زمانے کی ہے۔ سامرہ کی طرح یہاں بھی محراب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ جنوبی یا قبلہ رُخ دیوار سے تقریباً



شکل ۱۴ سامرہ کا مینار

چونتیس ۳۴ فیٹ کے فاصلہ پر اندر کی طرف اینٹوں کے پایوں پر اٹھائی ہوئی نوک دار کمانوں کا ایک چھتہ ہے۔ یہ چھتہ

پورے احاطہ سے لگا ہوا چلا گیا ہے۔ احاطہ کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں مشرقی اور مغربی سمتوں پر چھتے کی ستّرہ کمانوں کو اُٹھانے کے لئے نیم ستون لگائے گئے ہیں اس چھتے کے پایوں کے شمالی رُخ پر سولہ چھتّوں کی کمانوں کے سرے اُٹھانے کے لئے نیم ستون بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر چھتّے میں پانچ کمانیں ہیں۔ یہ کمانیں شمال سے جنوب کی طرف چلی گئی ہیں، اور ان پر حرم کا چھت ڈالا گیا ہے۔ ان چھتّوں میں بارہ چھتّوں کی شمالی کمانیں ان پایوں سے لگے ہوئے نیم ستونوں سے ٹکراتی ہیں جو حرم کو اس کے شمال میں صحن سے جدا کرتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی کناروں پر کے چھتّے مشرقی اور مغربی دیواروں کے متوازی احاطہ کی شمالی دیوار تک چلے گئے ہیں۔ یہاں ان کی آخری کمانوں کو اُٹھانے کے لئے پائے مہیّا کئے گئے ہیں۔ ان ہی چھتّوں سے مشرقی اور مغربی ایوان بنے ہیں۔ شمالی ایوان حرم کا جواب ہے، لیکن اسے پانچ کمانوں تک عمیق بنانے کی جگہ صرف تین کمانوں تک عمیق بنایا گیا ہے۔ حرم کے جنوبی چھتّے اور احاطہ کی جنوبی دیوار کی درمیانی جگہ چونتیس فیٹ چوڑی ہے۔ اس دیوار میں —— یعنی قبلہ رُخ دیوار میں —— تین موکھے ہیں۔ حرم اور شمالی ایوان کے صدر دالان اپنے بازوؤں کے بغلی دالانوں سے زیادہ چوڑے ہیں۔ غالباً سامرہ کی مسجد میں بھی ایسی ہی ترتیب موجود تھی۔

مسوپٹیمیا کی ان ویران مسجدوں میں دلچسپی کی کئی چیزیں ہیں
ابو دلف کی مسجد میں چھتّے شمالاً جنوباً بنائے گئے ہیں۔ یا دوسرے
الفاظ میں یہ چھتّے مکّہ کی سمت میں بنائے گئے ہیں اور اس
سمت کے اطراف میں نہیں بنائے گئے ہیں جیسے کہ دمشق میں
بنائے گئے ہیں۔ سامرہ میں بھی چھتّے ـــــ یا زیادہ صحیح یہ کہ
سروِل دار ستونی بر آمدے ـــــ شمالاً جنوباً بنائے گئے تھے
جیسا کہ نقشہ (شکل ۱۳) میں دکھایا گیا ہے۔ دونوں مسجدوں
میں قبلہ رُخ دیوار کے ساتھ ایک چوڑی جگہ چلی جاتی ہے جو
مرکزی دالان کے ساتھ مل کر نقشہ میں انگریزی حرف T
کی شکل بناتی ہے۔ ایسی ترتیب شمالی افریقہ کی مسجدوں میں
بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں مسجدیں اینٹ کی ہیں، اور بہت
بڑی حد تک کچی اینٹوں سے بنائی گئی ہیں۔ پایوں میں اور جہاں
کہیں زاویے آئے ہیں جیسے دروازوں کے پاکھے وغیرہ
وہاں پکّی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ جو حصّے کچّی اینٹوں سے
بنائے گئے ہیں ان میں زاویے نہیں پائے جاتے۔ کم از کم
کچّی اینٹوں میں ایسی جگہ زاویے نہیں بنائے گئے ہیں جہاں انھیں
صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کچّی اینٹوں سے جو حصّے بنائے گئے ہیں
جیسے احاطہ کی دیوار، گھڑ گچ، اور مینار وہ مدور بنائے گئے ہیں۔
مدور گوشے غالباً پتھر میں کچی مٹی کی اینٹوں کی نسل سے تعلق رکھتی
یا پتھر میں ایسی شکلوں کا جواب ہیں جو بذات خود دل کش ہیں،
لیکن ان کی تعمیری معقولیت کے لئے سنگی تعمیر کاری کی بہ نسبت کچی

اینٹوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ مدور گوشے بعد کے زمانے میں ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ کی سلجوقی سنگی مسجدوں میں اور اس سے بھی بعد کے زمانے میں قاہرہ کی سنگی مسجدوں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ایران کے خشتی اور ٹائیل سے مزین مینار اپنی مدور شکل کے لئے بے شبہہ کچّی اینٹ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی سے ٹائیل سے مزین سمرقند کی مسجدوں کے لئے مدور گوشوں والے پھاٹک بھی لئے گئے ہیں۔

سامرہ میں دریچوں کی کئی برگی کمانیں بھی قابل توجہ ہیں سٹوئر ڈیورا کا خیال ہے کہ یہ شکل ہندوستان سے آئی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ عباسی عہد میں مشرق میں ہندوستان تک کے دور دراز ملک سے بھی نئی شکلوں کے آنے کے امکانات موجود تھے۔ کئی برگی کمان مغرب میں اسپین تک پھیل گئی۔ یہاں مسجد قرطبہ میں یہ کمانیں سب سے زیادہ قابل لحاظ اور عجیب چیز بن گئی ہیں۔ محراب کی غیر موجودگی ایک اور دلچسپ چیز ہے مسوپٹیمیا کی پہلی مسجد یعنی کوفے کی مسجد کے لئے احاطہ کی کوئی دیوار نہ تھی۔ اس لئے نمازی کے بالکل مقابل محراب یا ایسی ہی کوئی تعمیری شے ہو بھی نہ سکتی تھی۔ اگرچہ سامرہ اور ابودلف میں احاطہ کی دیواریں کوفہ سے زیادہ خلوت نما ہیں، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی قبلہ کو سرے کو جہاں تک ممکن ہو کھلا رکھنے کی خواہش باقی تھی، اور اس مقصد کے لئے اس میں کمان دار موکھے دئے جاتے تھے۔ قبلہ رُخ دیوار میں محراب

بنانا شامی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔ اس کا خیال غالباً نصرانی کلیساؤں کے نیم قوسی طاق کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا۔ مسوپٹیمیا میں اسے یوں رد کر دیا گیا ہوگا کہ اس کی وجہ سے نماز پڑھنے والوں کی توجہ ہٹ جائے گی، اور مادی چیزوں کی وجہ سے حضور قلب سے ادا ہونے والی نمازیں خشوع و خضوع باقی نہیں رہے گا۔ غالباً اس کے رد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہوگی کہ ایک اسلامی عبادت گاہ میں اس قسم کی چیز کو عباسیوں کے خیال میں بنی امیہ جیسے بدچلن، بُرے اور بدکار خودسری جائز رکھ سکتے تھے!

مسوپٹیمیا کی ان خشتی مسجدوں کی تزئین سنگستر سے کی گئی تھی۔ غیر معمولی محنت سے اسے مختلف نمونوں میں ڈھالا یا گھڑا گیا تھا۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان پر روغنی رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ چکنی مٹی اور سنگستر کی یہ طرز تعمیر مسوپٹیمیا کا روایتی فن تعمیر تھا۔ اور بے شبہہ اسلام کے استقلال سے بہت پہلے سے مستعمل تھا۔ اس میں اور شام کے سنگی فن تعمیر میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ صرف ایسے ہی عناصر شام اور عراق کی مسجدوں میں مشترک ہیں جو دونوں کے مقاصد کے مشترک ہونے کا نتیجہ ہیں۔ بے شبہہ مسجد کے فن تعمیر میں ان مقاصد کی اصل نہ تو شامی ہے، نہ مسوپٹیمیائی بلکہ یہ عربی ہے اور دین عرب کی پیداوار ہے۔ صرف اس کے مقاصد ہی ہیں جہاں عرب نے اسلامی مذہبی فن تعمیر میں

اپنا حصہ ادا کیا ہے پس عرب کا حصہ روحانی قسم کا حصہ تھا، مادی قسم کا نہ تھا۔ یہ ایک امید، ایک آرزو، ایک تمنا تھی جس کو حاصل کرنے یا مہیّا کرنے کے لئے ان کے پاس ذرائع ناکافی تھے اور جب تک ایسی دوسری قوموں نے جو مادی ذرائع سے مالا مال ملکوں میں بستی تھیں، عربی دین قبول نہ کر لیا، انھیں ایسی ہی آرزوؤں اور تمناؤں سے دوچار ہونا پڑا۔ تب کہیں جاکر اس کے شایان شان تعمیری تکمیل ممکن ہوئی۔ تکمیل کا طریقہ مختلف ملکوں میں مختلف رہا۔ شام اور مسوپٹیمیا کے طریقہ میں بہت شدید اختلاف ہے کیونکہ ان کے حالات میں بھی شدید اختلاف ہے۔ ارضیاتی حیثیت سے یہ اختلاف پتھر اور چکنی مٹی کا اختلاف ہے، اور معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے یہ ایشیاء اور وادی بحیرہ روم کی تہذیب کا اختلاف ہے۔

تیسرا باب

مصر میں مسجد ابن طولون۔ قیروان میں مسجد سدی عقبہ اور مسجد قرطبہ ـــــ فاطمی سازش اور قاہرہ کی بنا

سامرہ کی شاہی چھاؤنی میں جو ترکی فوجیں رکھی گئی تھیں، ان میں ایک جوان احمد نامی بھی تھا۔ اس جوان کے باپ کا نام طولون تھا، اور اسے ۸۱۵ء میں بخارا کے والی نے خلیفہ مامون کی خدمت میں تحفتاً پیش کیا تھا۔ خلیفہ متوکل۔ ـــ جس نے سامرہ کی جامع مسجد بنوائی تھی ـــ کی وفات کے چار سال بعد فوجوں نے متوکل کے جانشین مستعین کو معزول کر دیا۔ اس وقت سپاہیوں میں احمد ابن طولون کا اثر و نفوذ بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ بغداد تک خلیفہ کو لے جانے کے لئے یہی احمد ابن طولون خلیفہ کی حفاظت کے لئے منتخب ہوا۔ ترکی فوجوں نے تقریباً سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اہم عہدوں اور صوبوں کی ولایت پر اسی کا تقرر ہونے لگا جو سب سے زیادہ طاقتور ترکی امیر ہوتا تھا۔ ایسے ہی حالات میں مصر کا زرخیز صوبہ احمد ابن طولون کے

حصہ میں آیا۔ احمد ابن طولون ایک صاحب کردار، قابل اور ذی علم آدمی تھا۔ سامرہ میں فوجی تعلیم کے سوا اس نے فقہ، الٰہیات اور عربی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ۸۶۸ء میں وہ مصر کے صدر مقام فسطاط میں داخل ہوا۔ؔ والی مصر کی حیثیت سے اسے جلد ہی اپنے عزائم اور اپنے مذاق کی تکمیل کے ذرائع حاصل ہو گئے۔ فسطاط کے باہر اس نے ایک شاہی نواح بسایا۔ اس میں محلات، گھوڑ دوڑ کا میدان چڑیا گھر، منڈیاں، حمام اور ایک جامع مسجد بنوائی۔ اس کی بنائی ہوئی ان تمام عمارتوں میں سے اب صرف جامع مسجد ہی باقی رہ گئی ہے۔ یہ جامع مسجد چھ ایکڑ زمین پر بنائی گئی ہے۔ اس میں سے خود مسجد کے لئے چار ایکڑ زمین لی گئی ہے، اور باقی تقریباً ساٹھ فیٹ چوڑی جگہ جو "زیادہ" کہلاتی ہے، مسجد کے اطراف تینوں بازوؤں پر چھوڑ دی گئی ہے۔ قاہرہ میں مسجدیں ٹھیک ٹھیک جنوب مشرق کی سمت میں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں بھی آسانی کے لئے جنوب مشرقی یا قبلہ رُخ دیوار مشرقی دیوار کہلاتی ہے۔ اور اسی نسبت سے دوسری دیواروں کے بھی نام رکھے گئے ہیں مسجد ایک مستطیل قطعہ زمین پر واقع ہے۔ اور یہ قطعہ غرباً شرقاً (۴۵۰) فیٹ طویل اور شمالاً جنوباً (۳۹۰) فیٹ عریض ہے۔ اس

ؔ تاریخ مصر، از اسٹینلی لین پول، ص ۶۰ ۔

HISTORY OF EGYPT. BY STANELY LANE POOL P. 60

قطعہ زمین کو ایک خشتی دیوار احاطہ کرتی ہے۔ مشرقی دیوار میں ایک محراب سمت نماز کی نشان دہی کے لئے بنائی گئی ہے۔ حرم احاطے کے پورے مشرقی سرے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا عمق مسجد کی پوری لمبائی کا ایک چوتھائی ہے۔ حرم کا چھت پانچ چھتّوں پر ڈالا گیا ہے، اور ہر چھتّے میں سولہ خشتی پائے ہیں۔ ان پایوں پر نوک دار کمانیں اٹھائی گئی ہیں۔ ہر چھتّے کے لئے حرم کے بازو کی دیواروں میں نیم ستون بنائے گئے ہیں۔ احاطے کے مغربی سرے کے اطراف ایک ایوان بنایا گیا ہے۔ یہ ایوان دو چھتّوں پر مشتمل ہے اور ہر چھتّے میں حرم کے پایوں کی طرح خشتی پایے ہیں۔ یہاں بھی ہر چھتّے کے نیم ستون بازو کی دیواروں میں بنائے گئے ہیں۔ بازو کی دیواروں سے متصل ہر ایک ایوان میں دو چھتّے ہیں جو حرم اور مغربی ایوان کے درمیان داخل کر دئیے گئے ہیں۔ حرم اور مغربی ایوان میں شمالاً سب سے آخری دو پایے، اور اسی طرح جنوباً سب سے آخری دو پایوں کے لئے نیم ستون مہیّا کئے گئے ہیں۔ اور یہ شمالی اور جنوبی ایوانوں کی کمانوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ شمالی بازو میں "زیادہ" سے پانچ داخلے ہیں، مغرب میں دو اور جنوب میں چار۔ مشرقی بازو میں ایک ہی داخلہ ہے اور یہ داخلہ غالباً خود والی کے لئے مختص تھا۔ صحن کے وسط میں وضو کے لئے ایک حوض ہے۔ مغربی سرے پر جو "زیادہ" ہے اس میں ایک مینار ایستادہ ہے۔ محراب

کے پیچھے مختلف ضرورتوں کے لئے تین چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں اور ان تک حرم میں دو دروازوں سے ہو کر پہنچ سکتے ہیں۔ "زیادہ" میں مشرق، مغرب اور جنوب کی سمتوں میں داخلے بنے ہوئے ہیں۔ محراب سے بالکل متصل مقابل میں کھانچے پر ایک چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے۔

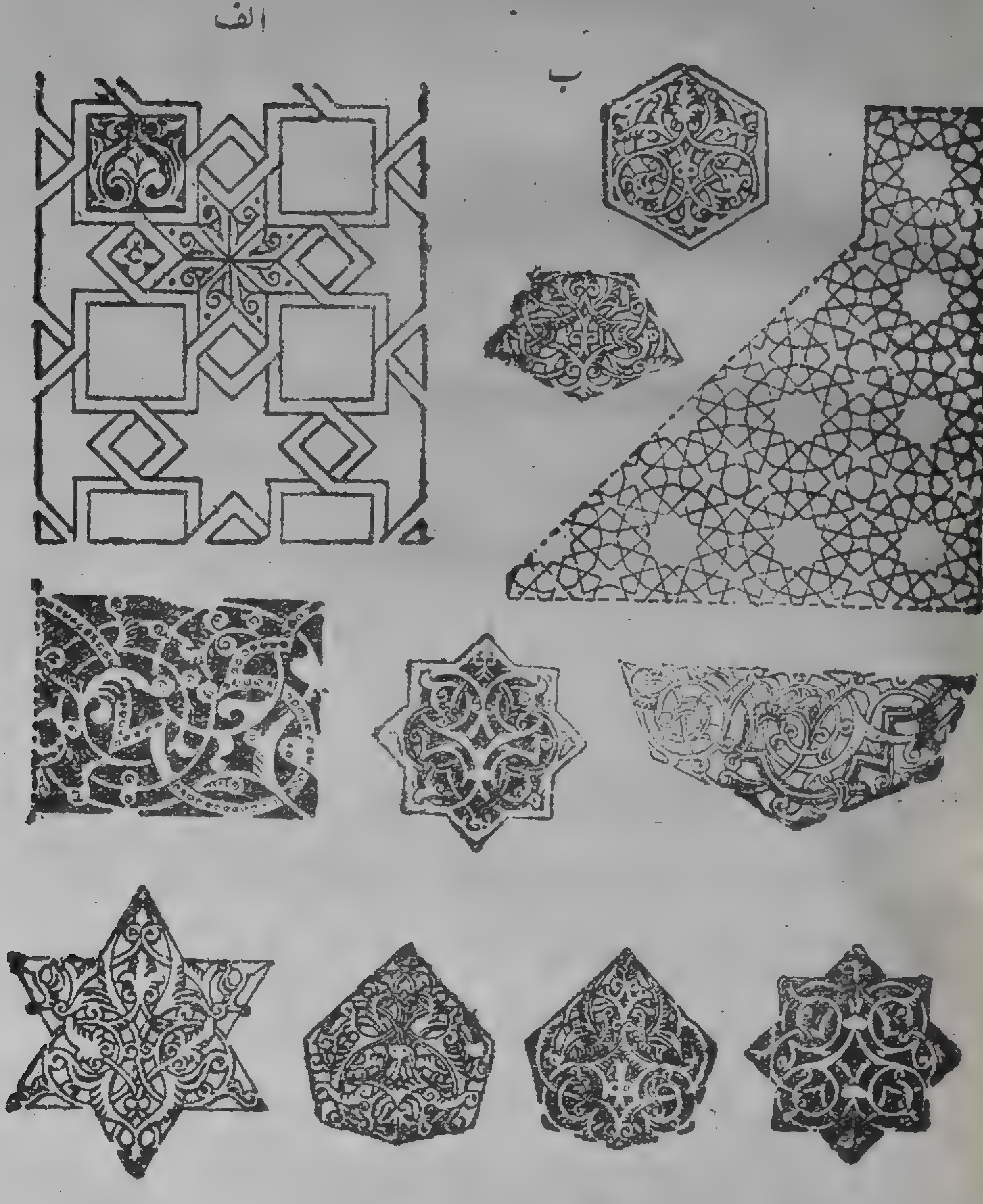
حرم، حرم تک پہنچنے کے لئے ایوانوں اور ایک کھلے صحن کے ساتھ یہ مصری مسجد دمشق کی شامی مسجد اور سامرہ اور ابودلف کی عراقی مسجدوں سے مشابہ ہے۔ ساخت میں یہ مسجد ابودلف کی مسجد سے اس طرح مشابہ ہے کہ جن چھتوں پر حرم اور ایوانوں کا چھت ڈالا گیا ہے وہ خشتی پایوں پر اٹھائی ہوئی نوک دار کمانوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن حرم اور ایوانوں کے چھتّوں کی آپس میں نسبت اور وہ سمت جس میں چھتّے قبلہ رُخ دیوار یا سمت نماز کی نسبت سے بنائے جاتے ہیں اس کی حد تک مصری مسجد مسوپٹیمیا کی مسجد سے بالکل مختلف ہے۔ مسوپٹیمیا کی مسجد میں حرم اور ایوانوں کے چھت کے چھتّے سمت نماز کے متوازی بنائے گئے ہیں اور صرف بازوؤں کے ایوانوں کے چھتّے سمت نماز کے متوازی بنائے گئے ہیں۔ لیکن مصری مسجد میں حرم کے چھتّے اس کے متوازی ہیں۔ دوسرے اختلافات یہ ہیں کہ مصری مسجد میں ایک محراب اور اس کے بالکل متصل سامنے کی جگہ پر گنبد ہے۔ ایک محراب، ایک گنبد

اور حرم کے چھتّوں کی آڑی ترتیب کے ساتھ مصری مسجد مسوپٹیمیا
کی مسجد کی بہ نسبت دمشق کی جامع کبیر سے مشابہ ہے۔ ابن طولون
کے تعمیر کار نے نقشہ بنانے میں چاہے جو بھی طریقہ اختیار کیا
ہو، یہ واضح ہے کہ اس نے مسوپٹیمیائی طریقہ اختیار نہیں کیا
اس نے یا تو اپنا ہی ایجاد کردہ طریقہ اختیار کیا یا وہ طریقہ
اختیار کیا جو پہلے سے مصر میں رائج تھا۔ المقریزی کے بیان
کے ہوتے ہوئے اس قصّہ میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نظر
نہیں آتی کہ یہ تعمیر کار ایک مصری تھا؛ ابن طولون اپنی
مسجد میں تین سو ستون لگانا چاہتا تھا؛ ابن طولون سے
جب کہا گیا کہ یہ بات اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب کہ
وہ نصرانی کلیساؤں میں سے ستون نکلوانے کے لئے تیار ہو
جائے؛ اس پر ابن طولون نے تین سو ستون لگانے کا
خیال چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس کے مصری تعمیر کار نے
ایک بے ستون مسجد کا خاکہ بنانے کا ذمہ لیا۔ وادیٔ نیل
میں اینٹ کا استعمال اتنا ہی عام ہے اور ہمیشہ سے
عام رہا ہے۔ جتنا کہ فرات اور دجلہ کی وادیوں میں
اینٹ کا استعمال عام ہے۔ چھتّوں کے لئے خشتی پایوں کا
استعمال مسجد کے خاکے کو مسوپٹیمیا کی مسجد سے منسوب
کرنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ مصر ایک ایسا ملک ہے
جو سنگی اور خشتی دونوں طرح کی تعمیروں کو یکساں طور
پر اختیار کرسکتا ہے۔ اگر ابن طولون کے عہد میں تعمیر کار

مقتدرہ جماعت کے ملک یعنی سنگی تعمیر کاری کے ملک سے آئے ہوتے تو اس کی یہ مسجد پتھر میں تعمیر ہوئی ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن طولون کی مسجد اینٹ میں بنائی گئی ہے۔ یہ حقیقت اس حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس وقت مصر میں بحیرۂ روم کی بہ نسبت ایشیا کی زیادہ حکومت تھی۔ تاہم کسی حد تک پچھلے شامی اور اس لئے ایشیائی سے زیادہ بحیرۂ روم کے اثرات اب بھی مصر میں ظاہر ہو رہے تھے۔ ان اثرات کا اندازہ ایک محراب، محراب کے اوپر گنبد، اور حرم کے چھتوں کی آڑی ترتیب کی موجودگی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ابن طولون کی مسجد کے نقشہ کی ترتیب مسوپٹمیائی نہیں ہے، تاہم اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کی تعمیر اور خاص کر اس کی تزئین میں اور صناعوں کے سوا مسوپٹمیائی صناع بھی لگائے گئے تھے۔ دیوار میں لگے ہوئے ستونوں کی شکل کے خشتی پایوں کے مدور گوشے صناعوں میں مسوپٹمیائی صناعوں کے موجود ہونے کا پتہ دے رہے ہیں۔ سنگستر کے سرستون کے ساتھ اسی قسم کے دیوار میں لگے ہوئے ستون رقہ (یہ مقام مسوپٹمیا میں واقع ہے) کی ایک ویران مسجد میں پائے جاتے ہیں۔ سرستون کی تزئین سنگستر میں ڈھالی ہوئی کلیوں اور پتیوں پر مشتمل ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلاسیکی کورن تھین سرستون کی نقل کرنے کی کوشش ہے۔ کمانوں کے پہلوؤں کے درمیان دریچے کے موکھے ہیں۔ اور ان میں ایسے ہی

ستون لگے ہوئے ہیں جیسے کے دیوار ہیں لگے ہوئے ستون ہیں ان کے اندر نکیلی کمانیں بنائی گئی ہیں۔ صحن کو گھیرے ہوے چھتے کے بیرونی رُخ دریچوں کے دونوں طرف شانۂ کمان ہیں سنگستری پھول توڑے گئے ہیں۔ سنگستری تزئین کی پٹی چھتّوں کی کمانوں کے اطراف چلی گئی ہے۔ کمانوں کے اوپر ایک اور پٹی ہے اور اس پٹی کے اوپر مورچہ بند منڈھیر ہے۔ بعض کمانوں کی شکموں پر ایک مخصوص دلچسپ تزئین ہے۔ یہ دو عناصر سے مرکب ہے، ایک عنصر ہندسی خاکہ ہے اور دوسرا عنصر مسلمہ بناتی نمونہ (شکل ۱۵ا)۔ تزئین کا یہ اصول اس مسجد میں کافی ترقی یافتہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ مصر میں مسوپٹیمیا سے آیا ہے، اور بہت ہی قدیم زمانہ کا ہے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے مسجد ابن طولون کا نمونہ اسلامی فن تعمیر میں تزئین کے اس اصول کے استعمال کا اولین معلومہ نمونہ ہے۔ یہ طریقہ تمام یا تقریباً تمام بعد کی سراسینی (اسلامی) تزئین کا اہم ترین موضوع بنا رہا ہے اور بے شمار متنوع صورتوں میں پتھر، گچ، لکڑی، دھات اور روغنی شیشوں کی صورت میں آنے والی تمام صدیوں میں اور پوری دنیائے اسلام میں ملتا ہے۔ مسلم صناعوں نے ان ذرائع سے مختلف شکلوں کی فصلوں کو پُر کرنے میں غیر معمولی ذکاوت کا ثبوت دیا ہے۔ شکل ۱۵ اب میں مسجد صالح طلعی (۱۱۶۶ء) کے منبر کی پیٹی کی ہندسی لکیروں اور بانڈوں اور کواڑوں

کے تختوں پر بنے ہوئے بعض مسلمہ نباتی نمونوں کی تفصیلات دکھائی گئی ہیں۔ کوئی جگہ چاہے وہ شکل میں کتنی ہی بے ڈھنگی کیوں نہ ہو، اسے ہندسی اور نباتی شکلوں کے امتزاج کے



شکل ۱۵ب اسلامی تزئین کے اہم اصول۔ یعنی ہندسی چوکھٹے میں نباتی نمونوں کی چند مثالیں (ا) مسجد ابن طولون سے (ب) مسجد صالح طلعی سے۔

ذریعہ کامیابی کے ساتھ پُر کی جاتی تھی، اور یہ کام بڑا کٹھن ہے۔ مسوپٹیمیائی اصل کی مسجد یعنی مسجد ابن طولون کی دوسری خصوصیت مینار ہے۔ اور اس کا کاک سکریو کی شکل کا چکر دار بیرونی زینہ بے شبہ مسوپٹیمیا کے میناروں سے لیا گیا ہے۔ ایسے مینار سامرہ اور ابودلف میں ہم دیکھ آئے ہیں ابن طولون کا مصر میں مسوپٹیمیا کے صناعوں سے کام لینا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اسلام میں ابھی تک تفریق پیدا نہیں ہوئی تھی، اور ایک حد تک اس کا رجحان قومیت کی بہ نسبت بین قومیت کی طرف تھا۔ اسلامی قلمرو میں لوگوں کو جہاں منفعت بخش کام ملتا وہ آزادانہ وہاں چلے جاتے تھے۔ اس کے سوا ابن طولون جیسا حکمران جو ایک نواح کی تعمیر میں پانچ ہزار دینار صرف کرنے پر تیار تھا، جو ناداروں میں روزانہ کم سے کم ایک ہزار دینار بانٹتا تھا، جو روزانہ اتنی ہی رقم اپنے دسترخوان پر صرف کرتا تھا، جو علما کو نوازتا تھا، جو ایک زبردست فوج اور بڑا خاندان رکھتا تھا،[۵] غرض وہ ایسا حکمران تھا جس کا ملک ہمسایہ ملکوں کے صناعوں کی توجہ جذب کرسکتا تھا۔ اس کے سوا مسوپٹیمیا سے ابن طولون کے پچھلے تعلقات بہت مستحکم تھے۔ مصر میں جب اس نے اپنی وسیع تعمیری مہمیں شروع کیں تو کچھ عجیب

۵۔ تاریخ مصر۔ از اسٹینلی لین پول، ص، ص ۶۵، ۶۶۔

HISTORY OF EGYPT, BY STANELY LANE POOLE P, P, 65, 66-

نہیں کہ اس نے بہت سے صناعوں میں مسو پٹیمیا کے صناعوں کو بھی فراہم کیا ہوگا۔ یہ مسجد ایک اور دلچسپ خصوصیت کی حامل ہے جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت یہ ہے کہ کمانیں نکیلی اور وضع میں کسی قدر گھوڑ نعلی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اولین معلومہ کمانیں نہیں ہیں، لیکن یہ انگلستان کی قدیم سے قدیم نکیلی کمان سے ڈھائی صدی پیشتر کی ہیں۔

مشرق بعید سے مغرب میں مصر اور اس سے اور آگے مغرب میں شمالی افریقی ساحل سے متصل صناعوں اور دوسرے لوگوں کی نقل و حرکت ابن طولون کے عہد سے بھی پہلے سے جاری تھی۔ مقیاس النیل (یہ چند سال پہلے فساط کے مقابل دریائے نیل میں واقع جزیرہ روڈا میں تعمیر ہوا تھا) کا تعمیر کار انتہائی مشرقی اسلامی ملک فرغانہ سے آیا تھا۔

شمالی افریقہ میں پہلی بار مصر سے اسلامی فوجیں داخل ہوئیں۔ عمرو بن العاص نے ۶۶۱ء میں عقبہ کو بربروں کے خلاف ایک مہم پر روانہ کیا تھا۔ ۶۷۰ء میں جب اموی خلیفہ معاویہؓ نے اور فوجیں روانہ کیں تو عقبہ نے تونس کے جنوب میں شہر قیروان بسایا اور وہاں ایک مسجد بنائی۔ اس وقت قیروان میں موجودہ جامع مسجد کا نام اگرچہ مسجد سدی عقبہ ہے، لیکن یہ وہ مسجد

نہیں جو عقبہ نے بنائی تھی۔ اصلی مسجد بربرون کی ایک بغاوت میں تباہ ہوگئی اور ایک نئی مسجد سنہ ۷۰۳ء میں بنائی گئی۔ اس مسجد کی توسیع یا از سرنو تعمیر ہشام (۷۲۴ء—۷۴۳ء) کے عہد خلافت میں اس وقت کے قیروان کے اموی والی بشر نے کی۔ بشر کی بنائی ہوئی مسجد میں اب مینار اور محراب کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے[۵]۔ یہ مینار قدیم ترین موجود مینار ہے۔ (شکل ۱۶) یہ سامرہ کے مینار سے تقریباً ایک سو سال پہلے کا مینار ہے۔ صرف نچلی منزل اصلی ہے۔ یہ منزل ایک بڑے برج کی شکل پر بنائی گئی ہے، اور اسے پکی اینٹوں سے اور بنیاد کی چنائی میں پتھر کے چند دور دے کر بنایا گیا ہے۔ یہ پچاسی فیٹ بلند ہے اور اس کے بازوؤں کی مساحت (۳۵) فیٹ ہے۔ اس کی دیواروں کی موٹائی ان کی بنیاد کے پاس دس فیٹ سے زیادہ ہے۔ اس مینار کا مربع نقشہ مسوپٹیمیائی خام خشتی تعمیر کاری کی بہ نسبت شام کی سنگی تعمیر کاری سے اپنا تعلق ظاہر



(شکل ۱۶ مسجد سدی عقبہ کا مینار)

۵۔ آرچیٹیکچرا مسلمانا۔ از جی، ٹی، ریویرا، ص ص ۳۳ و ۳۴۔

ARCHITECTURA MUSALMANA, BY G.T.RIVOIRA. P.P. 33,34.

کرتا ہے۔ خلیفہ ہشام، جس کے عہد میں یہ مینار تعمیر ہوا ہے اموی خلیفہ تھا، اور اس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ اور مینار کی وضع قطع اور اس کے ساتھ محراب کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ بنی امیہ کے عہد میں تعمیر کاری کے لحاظ سے بھی شمالی افریقہ میں شامی اثر سب سے زیادہ قوی تھا۔ بنی امیہ کے جانشین بنی عباس کی حکومت کو شمالی افریقہ کے عربوں اور بربروں نے تسلیم نہیں کیا۔ یہ لوگ بنو علی کی جانشینی کی طرف مائل تھے اور عباسیوں کے خلاف مسلسل بغاوت کرتے رہے۔ ان کے خلاف جو سپہ سالار بھیجے گئے ان میں ایک سپہ سالار قبیصہ تمیمی کا ایک عرب الدا غالب تھا۔ اس نے عباسی خلیفہ ابو جعفر (۷۵۴ - ۷۷۵ء) کے عہد خلافت کے آخری دور میں کچھ دنوں کے لئے اس ملک میں عباسی سیاحت قائم کر دی۔ مصر میں ابن طولون کی طرح الداغالب شمالی افریقہ میں ایک ایسے حکمران خاندان کا بانی ہوا جو عباسی اقتدار سے عملاً آزاد تھا۔ بعد میں زیادت اللہ (۸۱۶ - ۸۳۷ء) نامی اسی خاندان کے ایک امیر نے صرف محراب اور مینار کو باقی رکھ کر بشر کی بنائی ہوئی مسجد کی از سر نو تعمیر کی[۵]۔ عرض میں گنجائش محدود ہونے کی وجہ سے ان کا محل وقوع بے ڈھب سا تھا۔ اور زیادت اللہ نے عرض کو بڑھانے کی جو کوششیں کیں

[۵] محولہ بالا کتاب، جہاں اصل ماخذ دیئے گئے ہیں۔

یہ کوششیں دوسری سمتوں کی بہ نسبت قبلہ رُخ زیادہ کامیاب رہیں ــــ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقشہ بے ترتیب ہو گیا۔ صلاح الدین کے شائع کردہ نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نقشہ میں چند ایک ہی قائمہ زاویے ہیں، اور دونوں محوروں پر کے اصل خطوط میں سے ــــ محراب والی دیوار اور مینار کی دیوار کے قابل لحاظ استثنیٰ کے سوا ــــ چند ہی ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کے ہم عصر ہونے کے بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ مسجد جیسی آج قائم ہے، زیادت اللہ کی نئے سرے سے تعمیر کردہ مسجد ہے اور ابراہیم ثانی الاغالبی (۸۷۴ء ــ ۹۰۲ء) نے اس میں اضافے اور ترمیمیں کی ہیں۔

اغالبہ اگرچہ نسلاً عرب تھے، لیکن یہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مشرق بعید کے شہر مرو سے آیا تھا۔ شہر مرو، بخارا اور ایران کے شمال مشرقی گوشے کے درمیان مسوپٹیمیا سے لے کر ایران اور سمرقند اور اس کے آگے تک پھیلے ہوئے وسیع خشت کار علاقے کے حدود میں واقع ہے۔ بنی عباس نے بڑی حد تک ایرانی امداد کے ذریعہ اقتدار حاصل کیا۔ بنی عباس کے حصول اقتدار نے ان علاقوں کے حیرت انگیز حد تک باکمال لوگوں کو مغرب کی طرف منتقلی کے مواقع فراہم کئے اور

سے منقول۔ از اے، آر، گسٹ (A.R.GUEST)

اس کی ہمت افزائی کی ۔ بنی عباس کے عہد میں مصر بڑی حد
تک ایرانی بن گیا ۔ اور ابن طولون کے عہد اور اس کے بعد
سے اس ملک کا فن تعمیر کئی صدیوں تک بنیادی طور پر
خشت کار ملکوں کی روایتوں سے متاثر فن تعمیر ہی رہا۔
اموی عہد کے بعد اسی طرح کے اثرات شمالی افریقہ میں
کام کرتے رہے ۔ قیروان میں زیادت اللہ الداغالبی کی
دوبارہ بنائی ہوئی مسجد تقریباً (۵۶۰) فیٹ لمبی اور(۳۲۰)
فیٹ چوڑی ہے ، اور تقریباً سوا چار ایکڑ رقبہ پر پھیلی ہوئی
ہے ۔ مسوپٹیمیائی مسجدوں کی طرح احاطے کی دیوار میں
زبردست پشتے دیئے گئے ہیں ۔ عرض میں حرم ابن طولون
کی مسجد سے ساٹھ فیٹ کم ہے ۔ لیکن اس کا عمق مسجد
ابن طولون سے کہیں زیادہ ہے ۔ اور ابراہیم ثانی کی
بڑھائی ہوئی برساتی کو شامل کرکے اس کی مساحت(۱۸۰)
فیٹ سے زیادہ ہے ۔ زیادت اللہ کی مسجد میں ایک
عریض دالان محراب تک چلا گیا تھا اور قبلہ رُخ دیوار
سے متصل ایک چوڑی جگہ چھوڑ دی گئی تھی ۔ یہ دونوں
خصوصیتیں مسوپٹیمیائی طرز کی مسجد کے نقشہ کی ہیں۔ چھتے
قبلہ رُخ بنائے گئے ہیں ، اور یہ بھی ایک مسوپٹیمیائی
خصوصیت ہے ۔ ابراہیم ثانی نے ہر بازو پر ستونوں
کی ایک فاضل قطار بڑھاکر دالان کا عرض گھٹا دیا۔
ستونوں کی یہ فاضل قطاریں ان کمانوں کو سہارنے

کے لئے بڑھائی گئی تھیں جن پر دو گنبدوں کی زیرین عمارتیں قائم کی گئی تھیں۔ یہ گنبد بھی ابراہیم ثانی نے بنائے تھے۔ ایک گنبد محراب سے متصل فصل پر، اور دوسرا گنبد اپنی بنائی ہوئی برساتی کے وسط میں صحن کے رُخ پر۔ ابراہیم ثانی نے اپنی برساتی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے آڑھے ایوانوں کے چھتوں کو گرا کر پھر بنایا۔ زیادت اللہ کے کام میں اس طرح امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ ابراہیم ثانی کی تعمیر میں نکیلی اور قدرے گھوڑ نعلی کمانیں استعمال کی گئی ہیں۔ زیادت اللہ کی بنائی ہوئی کمانیں نیم دائرہ ہیں۔ محراب سے متصل فصل پر گنبد بنا کر ابراہیم ثانی کے معماروں نے شامی طرز کی پیروی کی ہے۔ لیکن زیرین تعمیر کے مربع کو گنبد کے دائرے میں تبدیل کرنے کا طریقہ ایرانی ہے۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو قبل اسلام کے معماروں نے فیروز آباد، سروستان، اور ایران کے دوسرے مقاموں پر اختیار کیا تھا۔ یہ نیم مخروطی وضع کے کروی حصوں پر مشتمل ہے، اور یہ مربع کے گوشوں پر پر بنائے گئے ہیں۔ (شکل ۱۷) گنبد کے یہ کروی حصے گچ کے کام میں گھونگھے کے ایک نمونے سے مزین کئے گئے ہیں اور کلاسیکی فن تعمیر کے گھونگھے کے نمونے کی یاد دلاتے ہیں۔ جن کمانوں پر گنبد بنایا گیا ہے ان کے شانوں میں چھوٹے طاق بنائے گئے ہیں۔ ان طاقوں

کے سرے پنج برگی کمانیں ہیں، اور ان پر چھوٹے چھوٹے
پھول بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب مسوپٹیمیائی وضع کے ہیں۔
اور سامرہ کی پنج برگی سروں والی کمانوں کی یاد تازہ
کرتے ہیں۔ اسی طرح کی تزئین محراب کے اوپر دیوار
پر بھی نظر آتی
ہے۔



شکل ۷۷۔ قیروان کا گنبد محراب صعود کا رُخ دکھاتے ہوئے

دالان کے
دوسرے کنارے
پر جو گنبد ہے
اس میں صعود
کا ایک دوسرا
طریقہ استعمال
کیا گیا ہے۔
یہاں مربع کے
گوشوں میں
گھوڑ نعلی کمانوں
کے ذریعہ فصل
پیدا کیا گیا ہے
اور اس طرح ایک مثمن بنا کر اس پر گنبد قائم کیا گیا ہے۔
مسجد قیروان کے معمار مسجد ابن طولون کے معماروں
سے زیادہ خوش نصیب تھے۔ کیونکہ انھیں بڑی تعداد

میں مختلف قسم کے اور انتہائی خوش نما مرمریں ستون اور سر ستون ہاتھ آئے تھے۔ یہ ستون اور سر ستون قبل اسلام نصرانی اور بت پرستوں کے زمانوں کی عمارتوں سے حاصل کئے گئے تھے۔ اسی طرح ہر قسم کی کرسیاں بھی ملیں اور انھیں استعمال کیا گیا۔ زیادت اللہ کے ابتدائی کام میں ان ستونوں پر جو کمانیں اٹھائی گئی ہیں، ان کے گردنوں کے لئے کافی وسیع جگہ مہیا کرنے کی غرض سے سر ستونوں کے اوپر چوبی پر لا کے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایسی کافی مضبوط زیریں تعمیر بنانے کے لئے جس پر کمانیں بنائی جاسکیں، ایک ستون سے دوسرے ستون تک چوبی جوڑ دئے گئے ہیں۔ جب کبھی پرانے زمانے کے ستون استعمال کئے جاتے تو اسلامی تعمیر کاری میں عام طور پر چھتّے بنانے کا یہی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔ لکڑی کے استعمال میں کئی خرابیاں بھی ہیں: یعنی جب لکڑی گل جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری لکڑی لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لکڑی کے بالکل گل جانے کا علم پہلی مرتبہ تب ہی ہوگا جب کہ پوری عمارت بیٹھ جائے۔ قیروان میں جو ستون استعمال کئے گئے ہیں وہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ حجم میں ان کا مقابلہ دمشق میں ولید کی بنائی ہوئی مسجد کے عظیم الشان یک سنگی ستونوں سے نہ کرنا چاہیئے۔ عمارت کو بلند کرنے کے لئے اونچے اونچے گردنے دے کر

کمانیں کافی بلندی پر قائم کی گئی ہیں۔ ابتدائی اسلامی کام کے لحاظ سے جامع قیروان خاص طور پر دلچسپ مثال ہے کیونکہ اس میں بہت سے ایسے عناصر موجود ہیں جنھوں نے آگے چل کر اسلامی فن تعمیر کی شکل اختیار کی ہے۔ ان میں ایسے عناصر بھی ہیں جو رومی تمدن سے اور عام طور پر بحر روم کے قبل نصرانیت اور نصرانی زمانے کے تمدن سے ورثے میں آئے یا حاصل کئے گئے ہیں۔ ان میں ستون سر ستون، چوکیاں اور ان کے سوا محراب اور مربع مینار شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر عنصر نیم قوسی طاق سے اخذ کی گئی ہے دوسرا عنصر بھی خاص طور پر شامی ہے، اور یہ چیز بحر روم سے زیادہ ایشیا کی چیز ہے۔ دوسری طرف گنبد کے مخروطی کروی حصے، کثیر برگی کمان کی محرابیں، گچی کاری کی تزئین، گھوڑ نعلی کمان، یہ تمام ایشیائی چیزیں ہیں۔ یہ چیزیں یا تو مسوپٹیمیا اور ایران سے یا ان ملکوں کے ذریعہ ہندوستان تک کے دور دراز ملکوں سے لی گئی ہیں۔ مسٹر ہاول کے بیان کے مطابق کثیر برگی کمان کی شکل ہندوستان میں بدھ مت کے زمانے میں موجود تھی[۵]۔ مینار کی مربع شامی شکل شمالی افریقہ میں عام طور پر رائج ہوئی۔ اس کی پہلی مثال قیروان کا مینارہ ہے۔ اندلس میں بنی امیہ

---

[۵] ہندوستانی فن تعمیر۔ از ہاول، ص ص ۱۸۲ — ۱۸۳

HAVELL'S INDIA ARCHITECTURE, PP. 182 — 183.

نے اسے رواج دیا۔ یہ مربع شکل ان ملکوں میں مینار کی مسلمہ شکل بن گئی۔ یہاں خشتی اصل سے تعلق رکھنے والی بیشتر ایرانی ماخذوں کی سبک اور عجیب و غریب شکلوں نے ان کی جگہ کبھی نہیں لی۔ ایسی شکلوں کو خاص طور پر مصر میں بڑی ترقی حاصل ہوئی۔

ابن طولون کی مصری مسجد اور شمالی افریقہ کی جامع سدی عقبہ واقع قیروان کی طرح جامع قرطبہ اندلس بھی بعض ایسی خصوصیتوں کی حامل ہے جو دوسرے ملکوں کی عمارتوں اور اس عمارت کی مخصوص چیزوں میں ایک تعلق پیدا کرتی ہیں۔ اندلس پر عربوں کے حملے کے وقت اس مسجد کے محل وقوع پر سان وسنتے (San Vicenta) کا کلیسا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چھٹی صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ پہلے یہ خود بھی ایک رومی معبد تھا اور بعد میں اسے کلیسا بنا لیا گیا تھا۔ دمشق کی طرح قرطبہ میں بھی مسلمانوں نے نصرانیوں کے اس کلیسا کا صرف نصف حصہ اپنی عبادت کے لئے لیا تھا۔ بعد میں عبدالرحمٰن اول (۷۵۶ء — ۷۸۸ء) نے پورا کلیسا خرید لیا۔ عبدالرحمٰن نے کلیسا کو ڈھا دیا اور سنہ ۷۸۶ء میں مسجد کی بنیاد رکھی عبدالرحمٰن کے بیٹے ہشام اول (۷۸۸ء — ۷۹۶ء) نے اس مسجد کی تعمیر کے کام کی تکمیل کی اور اس کے آگے مربع مینار بنایا۔ المنصور (۹۷۷ء — ۱۰۰۰ء) کے عہد

تک تمام جانشین حکمرانوں نے اس مسجد کی توسیع کی، اس کی تزئین میں حصّہ لیا، اس کی مرمت کرائی، اور اس میں ردّوبدل کرتے رہے۔ منصور نے اسے جس حال میں چھوڑا تھا وہ اسی طرح سنہ ۱۲۳۶ء تک برقرار رہی۔ یہاں تک کہ فرڈ نینڈ سوم نے شہر قرطبہ پر قبضہ کیا اور مسجد کو کلیسا میں تبدیل کرکے اسے کنواری بی بی مریم کے نام معنون کر دیا۔ سنہ ۱۲۳۸ء میں یہ کلیسا اسقفی کلیسا بنا دیا گیا۔[۵] اس مسجد کا بانی عبدالرحمٰن، اموی خلیفہ ہشام (۷۲۴ء — ۷۴۳ء) کا پوتا تھا جس کے عہد میں قیروان کا عظیم الشان مینار تعمیر ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن اول (۷۵۶ء — ۷۸۸ء) نے مسجد کا جو نقشہ ڈالا تھا اور کچھ بنوایا بھی تھا وہ احاطہ کی ایک سلامی دیوار اور اس کے اندر ایک حرم پر مشتمل تھا۔ حرم کا چھت دس چھتّوں پر اُٹھایا گیا تھا۔ یہ چھتّے قبلہ کی سمت جاتے تھے اور دس بغلی دالان اور ایک وسطی دالان بناتے تھے۔ وسطی دالان بغلی دالانوں سے زیادہ چوڑا تھا۔ حرم کے باہر صحن تھا۔ اس کی تینوں سمتوں پر دالان تھے۔ اصل مسجد کا عرض تقریباً تین سو فیٹ کے قریب تھا۔ اس کے اصلی طول کا علم نہیں۔ اصل مسجد کے چھتّے اب

---

[۵] ارکیٹکرا مسلمانا، از جی، ٹی، رلویرا، میلان سنہ ۱۹۱۴ء ص ۲۶۱۔

ARCHITECTURA MUSULMANA, BY G.T. RIVOIRA, MILLANE 1914, P. 361-

تک برقرار ہیں اور بڑی تعمیری اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ چھتے سنگ مرمر کے ستونوں پر اُٹھائے گئے ہیں۔ ستون پرانی عمارتوں سے لئے گئے ہیں۔ ان پر جو سر ستون لگے ہیں وہ عہد اسلام سے پہلے کے ہیں۔ سنیور ریویرا[۵] کے بیان کے مطابق یہ پہلی صدی سے لے کر ساتویں صدی تک کے ہیں۔ ہر جگہ یہ اپنے دھڑوں پر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ پتھر کے پر لا کے قیروان کی طرح لکڑی کے نہیں ہیں۔ یہ گرد لنوں کے لئے کافی نشست مہیا کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ان گردلنوں پر گھوڑ نعلی کمانیں اٹھائی گئی ہیں۔ ہر ستون پر ان کمانوں کی جست ہی اٹھائی نہیں گئی ہے بلکہ اس پر ایک پایہ بھی ہے جو سر ستون کے اوپر بنے ہوئے توڑے پر طولاً نصب کیا گیا ہے۔ ان پایوں پر کمانوں کی ایک اور قطار گھوڑ نعلی کمانوں کی بہ نسبت اور زیادہ بلندی پر قائم کی گئی ہے۔ اوپر کی کمانیں نیم دائرہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ترکیب کا مقصد استواری کو کسی قسم کا دھکا پہنچائے بغیر عمارت کو بلند کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ قدیم زمانے کے لیکن ان سے نسبتاً چھوٹے ستونوں کو استعمال کرنا ہے جو آسانی

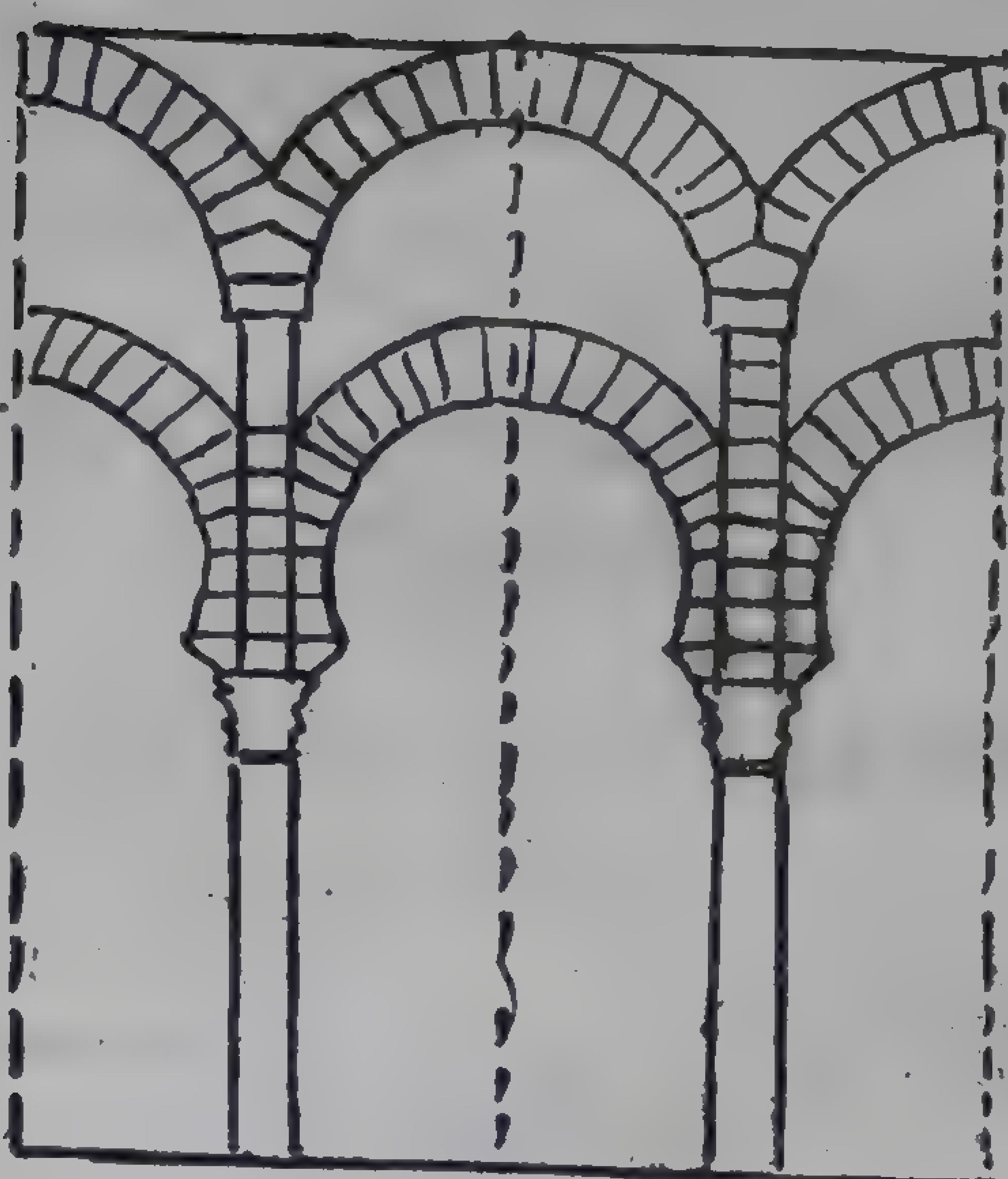
---

۵ ارکیٹکرا مسلمانا، از جی، ٹی، ریویرا، میلان سنہ ۱۹۱۴ء ص ۳۶۷۔

ARCHITECTURA MUSULMANA, BY. G.-T. RIVOIRA, MILLANE 1914

P. 367

کے ساتھ دستیاب ہو سکتے تھے۔ خیال ہو سکتا ہے کہ گھوڑ نعلی وضع کی نچلی کمانیں (شکل ۱۸۱) غیر ضروری تھیں۔ اور بلندی حاصل کرنے اور ساتھ ہی قدیم ستونوں کو استعمال کرنے کے لئے اگر کچھ ضروری تھا تو وہ یہ تھا کہ کمانوں کو کافی بلند ستونوں پر اُٹھایا جاتا۔ نظری طور پر یہ اعتراض صحیح ہے، لیکن عملاً گچ پتھر کے ایسے پایوں کا نازک دھڑوں کے سروں پر (جن کے سر اور پیر میں لگا ہوا سیسہ قدیم عمارتوں سے نکالنے اور ان کو پھر نصب کرنے میں خراب ہو چکا ہو) بنانا اور پھر ان پایوں کی چوٹیوں پر کمانوں کا اُٹھانا خطرے سے خالی کام نہیں ہے۔ اس طرح عمارت کی ذرا سی چال بھی پوری عمارت کو گرا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ادھر کمانوں کی نچلی قطار بنا کر معمار ایک ایسی زیرین تعمیر مہیا کرنے کے قابل ہوئے جو مزید کمانوں اور ان پر اُٹھانے والے پایوں کو

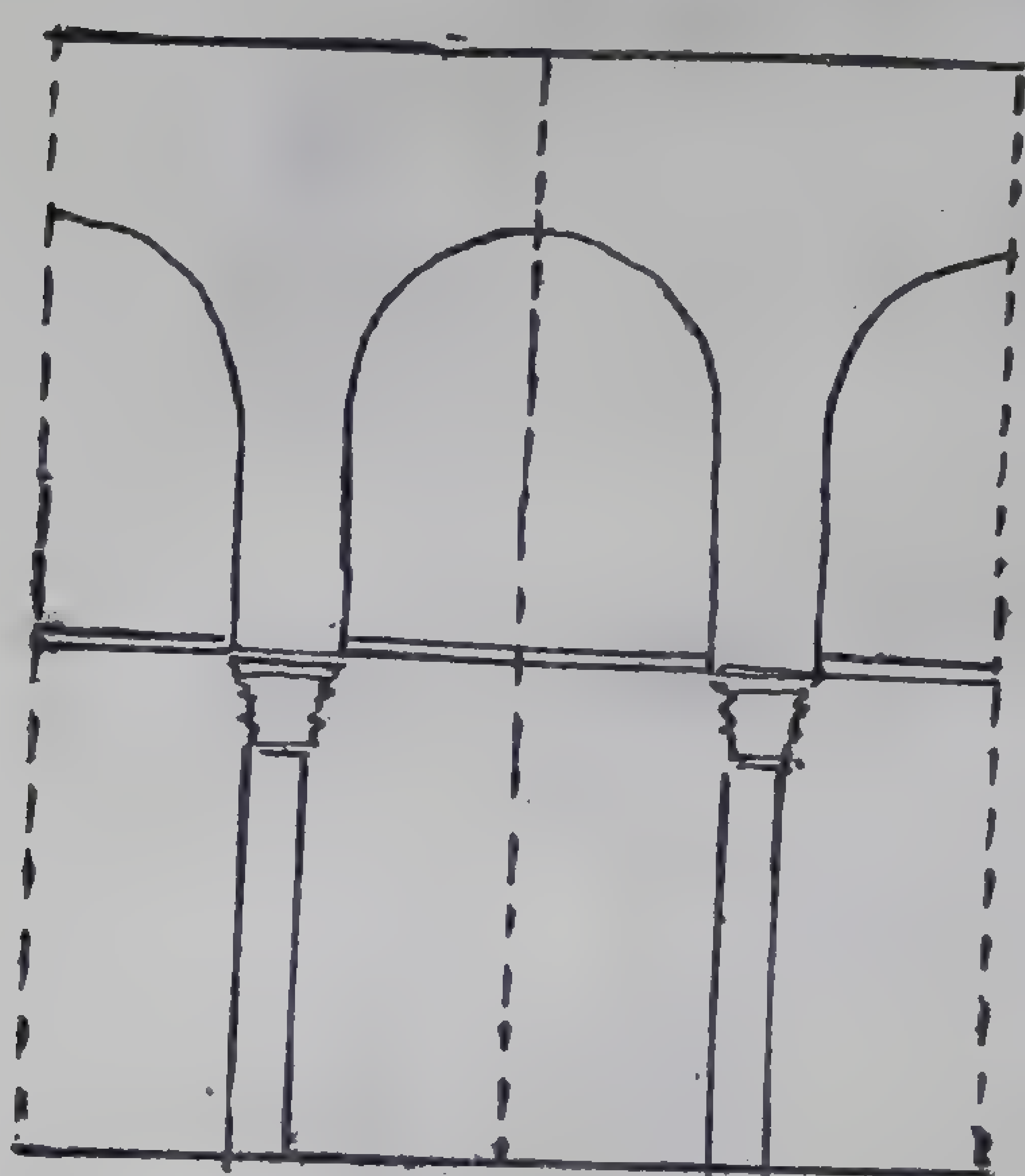


شکل ۱۸۱ مسجد قرطبہ میں بلندی حاصل کرنے کا طریقہ

سہار سکتے تھے ۔ یہ کمانیں مطلوبہ بلندی حاصل کر لیتی ہیں۔ اس قابل حصول تعمیری مسالے کو لے کر اس کو تعمیر میں استعمال کرنے کے مسئلہ کا اس سے بدیع اور اس سے زیادہ حیرت انگیز حل سوچنا ممکن نہیں ۔ اس کے سوا یہ حل دائمی چوبی متصلب پل کے لگانے سے بچا لیتا ہے ۔یہی طریقہ قیروان میں استعمال کیا گیا ہے (شکل ۱۹) لیکن ایسے طریقہ کی خرابیاں پہلے ہی بیان کی جا چکی ہیں ۔

الحاکم ثانی (۹۶۱ - ۹۷۶) کے تعمیری کاموں میں سب سے زیادہ قابل لحاظ کام محراب اور اس کے آگے کا مقصورہ ہے ۔ محراب کا نقشہ مثمنی ہے اور ایک یک سنگی مرمریں قبہ سے ڈھکا ہوا ہے ۔ اس قبہ کے اندر سیپ میں نقش و نگار بنائے گئے ہیں ۔ اس کے آگے کے محصورہ حصّے کو تین مربع کھانچوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں درمیانی کھانچہ ایک چھوٹے سے گنبد سے ڈھکا ہوا ہے ۔ قیروان میں ابراہیم ثانی نے دہلیز کے درمیانی کھانچے پر جو گنبد بنایا تھا ، وہ ایسی کمانوں پر اُٹھایا گیا تھا جو زیریں تعمیر کے مربع کے زاویوں پر بنائی گئی تھیں اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ایک مثمنی گنبد حاصل ہو سکے ۔ قرطبہ میں محراب کے مقابل محصورہ حصّے کے وسطی کھانچے پر گنبد اُٹھانے کے لئے حاکم ثانی کے معمار نے مربع سے مثمن میں صعود کے اس طریقہ

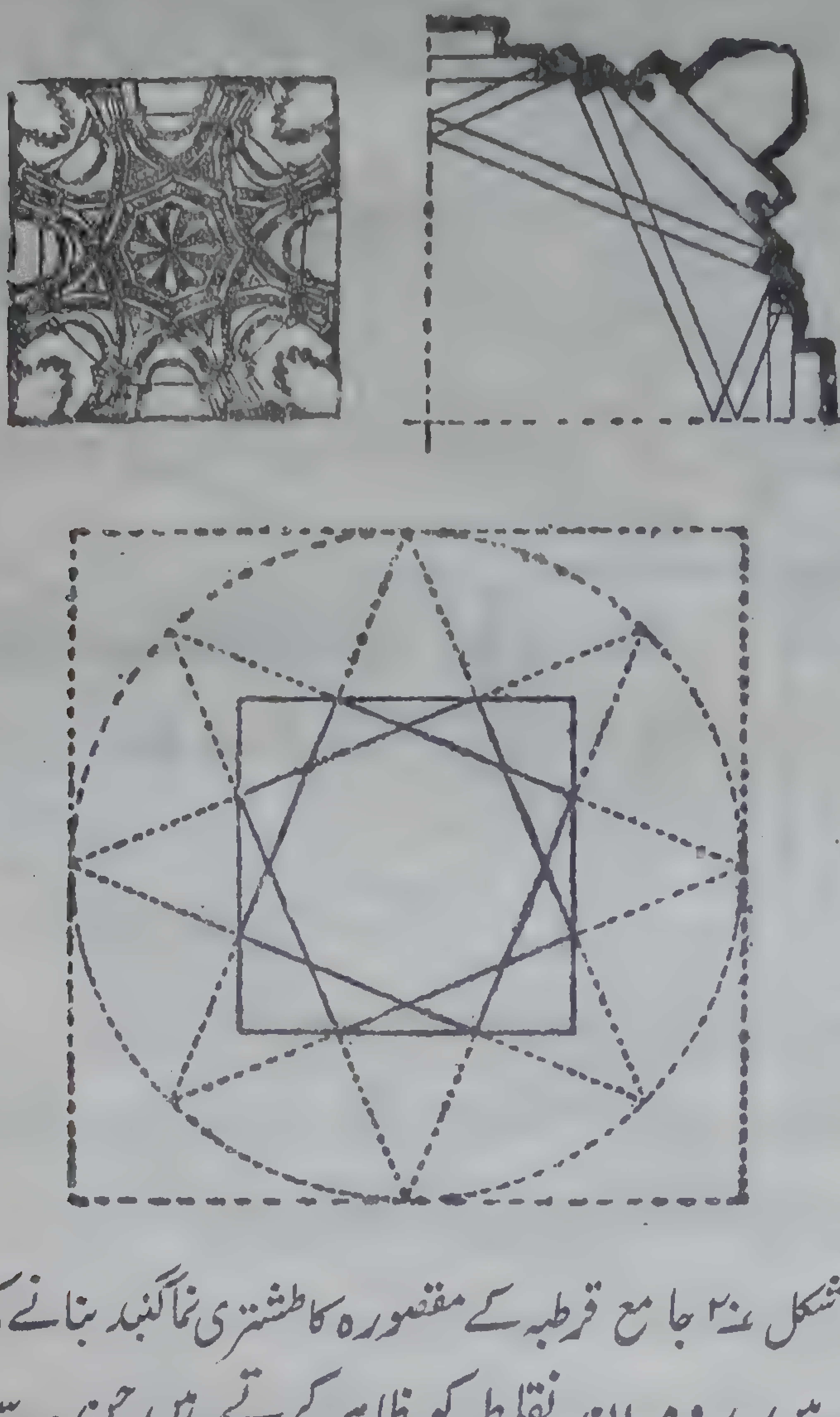
کو پُر کار بنایا ہے۔ مربع کے گوشوں پر کمانیں اس نے بھی اُٹھائی ہیں۔ لیکن گوشوں کے اطراف ۴۵° درجے پر چار کمانیں نکال کر مثمن بنانے کی بجائے حاکم کے معماروں نے ہر گوشے پر دو کمانوں کے حساب سے آٹھ کمانیں اس طرح اُٹھائیں کہ آٹھ کمانوں میں سے ہر ایک کمان کو دوسری دو کمانیں قطع کرتی ہیں۔ نقشہ پر یہ آٹھ کمانیں ایک بڑے مربع کے اندر ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو مربعوں کی شکل بناتے ہیں۔ اس طرح کی ترتیب (شکل نمبر ۲۰) قائم کرنے کا طریقہ حسب ذیل ہے:—



شکل نمبر ۱۹۔ مسجد سدی عقبہ قیروان میں بلندی حاصل کرنے کا طریقہ

شکل میں مستقل خطوط والا مربع اس رقبہ کو ظاہر کرتا ہے جس پر ایک مثمنی شکل کا طشتری نما گنبد یا قبہ بنانا مطلوب ہے۔ مربع کے مرکز سے ایک دائرہ کھینچو جس کا قطر مربع کے قطر کا دُگنا ہو۔ دائرے کے محیط کو آٹھ برابر حصوں میں اس طرح تقسیم کرو کہ ناصف نقاط دائرے کے محور پر پڑیں۔ جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے دائرے اور

مربع کے اطراف ایک دوسرے کو قطع کرنے والے دو مربع بنتے ہیں جو ٹھیک مربع کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ نقاط جہاں ایک دوسرے میں بیٹھے ہوئے مربعوں کے زاویئے اپنے محصور مربع کے محیط کو



شکل ۲۰: جامع قرطبہ کے مقصورہ کا طشتری نما گنبد بنانے کی ہندسی اساس

چھوتے ہیں، وہ ان نقاط کو ظاہر کرتے ہیں جن سے ایک دوسرے کو قطع کرنے والی کمانیں اٹھائی گئی ہیں۔ ہر کمان

ایک ایک آویزے سے نکالی گئی ہے۔ یہ آویزہ دیوار کے کنارے پر کھڑے ہوئے چھوٹے دہروں کے سروں پر رکھے ہوئے سرستون پر یا کہنا چاہیئے کہ دیوار سے قدرے آگے توڑا دے کر نکالے ہوئے ایک چھجّے پر اُٹھایا گیا ہے۔ اس سے آگے ایسے ہی دہروں پر توڑا اٹھایا گیا ہے جس سے گھوڑ نعلی وضع کی اکہری کمانیں گوشوں کے اطراف نکالی گئی ہیں۔ زاویئے کی کمانوں کے جواب میں دیواری کمانیں مثمن کے متبادل نقاط پر بنائی گئی ہیں اور انھیں زاویوں پر لگے ہوئے پایوں کے توڑوں پر اٹھایا گیا ہے۔ ان آٹھ گھوڑ نعلی کمانوں سے بننے والی جگہوں میں دریچے بٹھائے گئے ہیں۔ ہر گوشے کے اطراف اور مذکورہ کمانوں سے نسبتاً نیچی سطح پر ایک کثیر نعلی کمان نکالی گئی ہے جس کے پیر مثلث نما توڑوں پر اُٹھائے گئے ہیں۔ عمارت کا یہ پُرکار حصّہ پتھر کا ہے۔

ایک مربع زیرین تعمیر کے ہر گوشے پر ایک دوسرے کو قطع کرنے والی کمانوں کے ذریعہ صعود کو موثر بنانے کا ایسا ہی طریقہ، لیکن بہت بڑے پیمانہ پر، ہندوستان کے شہر بیجاپور میں اپنی جامع مسجد کے لئے علی عادل شاہ (۱۵۵۷ء - ۱۵۷۹ء) نے اور اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر بیجاپور ہی میں اپنے مشہور مقبرے

کے لئے محمود عادل شاہ (۱۶۲۶ء - ۱۶۶۰ء) نے اختیار کیا تھا۔
قرطبہ میں دہلیز یا ڈیوڑھی کی زیریں تعمیر جس کا مذکورہ گنبد درمیانی کھانچے پر بنایا گیا ہے، وہ ایسے ستونوں پر مشتمل ہے جن پر پنج برگی کمانیں اٹھائی گئی ہیں۔ اور دیوار میں لگا ہوا ایک چھوٹا سا ستون بھی دیا گیا ہے۔ اس کی کرسی نچلے ستون کے سرِ ستون کی سطح سے ذرا اوپر ایک آویزہ پر قائم کی گئی ہے۔ گھوڑ نعلی کمان کی کگر کو ایک سہ برگی کمان قطع کرتی ہے جو پنج برگی کمانوں کے سرے سے نکلتی ہے۔ ایک دوسرے کو قطع کرنے والی کثیر برگی کمانوں کے عمارتی استعمال کی یہ اولین مثال ہے۔ اس کا نتیجہ ایک طرح کا کٹاؤ کام ہے۔ یہ کٹاؤ کام اس ہلالی کٹاؤ کام کی یاد دلاتا ہے جس نے بعد کے زمانے میں نصرانی فن تعمیر میں فروغ پایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرون وسطیٰ کا نصرانی فن تعمیر بہت بڑی حد تک مشرق کا رہین منت ہے۔ نکیلی کمان، ہلالی، کثیر برگی کمانوں کو ایک دوسرے میں سے گذار کر کٹاؤ کام کا سا اثر پیدا کرنا، دیوار میں لگا ہوا دہرا یا ستون، یہ سب ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو مشرق سے آئی ہیں۔ اس خیال میں بہت بڑی حد تک صداقت موجود ہے کہ اگر اسلام کا ادارہ اور اس کی فتوحات نہ ہوتیں، اور ان فتوحات نے مشرق

اور مغرب میں قریبی تعلقات پیدا نہ کر دئے ہوتے تو نصرانی فن تعمیر ان خطوط پر ترقی نہ کر سکتا جن خطوط کو واقعتاً اختیار کرکے اس نے ترقی کی ہے۔ بحیرۂ روم کے ممالک، اطالیہ فرانس اور اسپین یہ سب کے سب ممالک پہلے ہی سے مشرقی ممالک کے اثرات سے راست متاثر تھے۔ اس خیال میں جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کوئی چیز غیر ممکن نظر نہیں آتی کثیر برگی کمان ہندوستان جیسے دور دراز ملک سے آئی ہے۔ اسلام نے ایک عام مذہب اور ایک عام معاشرتی نظام پیش کیا، اور دنیا کے ایک بہت بڑے رقبہ پر اس کو قائم بھی کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ زبردست برّی تجارت کو بھی فروغ دیا، غرض یہ سب چیزیں مل کر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق میں علم پھیلانے کا ذریعہ بنیں۔ یہ ذرائع اتنے ہی موثر تھے جتنے کہ اب ہمارے بس کے ذرائع موثر ہیں۔ لیکن اگر کثیر برگی کمان کا خیال ہندوستان سے آیا بھی ہے تو اس کا عمارتی استعمال اور اس میں پُرکاری صرف اسپینی مسلمانوں کی ندرت خیال اور مہارت کی رہین منت ہے۔

مسجد قرطبہ کی تزئین میں پچی کاری سے کام لیا گیا تھا۔ قسطنطنیہ ہی نے جامع دمشق کی طرح اس مسجد کے لئے بھی پچی کاری کا مسالہ (اس مسالہ کے ۳۲۰ قنطار

بھیجے گئے تھے) اور صناع دونوں فراہم کئے تھے۔

اس کے بعد اسلامی فن تعمیر میں مزید اہم ترقیاں فاطمین کے اقتدار حاصل کرنے سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ خاندان نہ ہوتا تو اسلامی فن تعمیر کا پورا دور کچھ اور ہی ہوتا۔ اس خاندان کی بنا ایک عالمی سازش کی رہین منت ہے۔ کربلا کے حزنیہ کے بعد سے اسلامی دنیا نے بنو علی کی حمایت میں بہت سی کوششیں ہوتی دیکھیں۔ لیکن دنیوی اقتدار کی بازیافت کے لئے اس خاندان نے جتنی بھی کوششیں کیں وہ سب کی سب ناکام رہیں تاہم ربّانی اقتدار کا عقیدہ اور بنو علی کا تقدس برابر باقی رہا اور زور شور سے اس کا پرچار ہوتا رہا۔ مہدی یعنی "ہدایت کرنے والا" اور مقدس ہادی یا امام کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور حضرت علی کے راست اخلاف میں کسی کی ذات میں اپنی نمائندگی کرتا ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ کچھ عرصے تک روپوش رہنے کے بعد وہ ایک نہ ایک دن پھر نمودار ہوگا۔ اس کی ذات میں الوہیت جنم لے گی۔ وہ واپس آئے گا تو سُنّیوں کی خلافت کا خاتمہ کر دے گا، اور ایک ایسے اسلام کو مستحکم کرے گا جو تمام برائیوں سے پاک اور منزہ ہوگا۔ ایسے ہی بنیادی عقائد تھے جو حضرت علی کے پیرو جو شیعہ یا شیعان علی بھی کہلاتے تھے، اپنے

دل میں گھڑ رہے تھے شیعوں اور سنیّوں کے اس زبردست عقائدی اختلاف سے بعض ناعاقبت اندیش من چلے افراد نے اپنے لئے اقتدار حاصل کرنے میں بڑی چالاکی سے فائدہ اُٹھایا۔ ایسے لوگوں میں سب سے اہم اور فہم وتدبر کے لحاظ سے سب سے اول عبداللہ ابن میمون نامی ایک شخص پیشہ کا معالج چشم اور نسل کا ایرانی تھا۔ اس شخص نے[1] اپنے دل میں عربوں اور اسلام سے شدید نفرت پال رکھی تھی۔ عبد اللہ ابن میمون کا ارادہ کچھ یہ تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ دے اور اگر اپنے لئے ممکن نہ ہو تو اپنی اولاد کے لئے تخت حاصل کرے[2]۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اسلام سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، اور یہ سب کے سب پکّے ملحد تھے۔ اوہ اپنے مقاصد کی تکمیل ایک عالمی انقلاب کے ذریعہ کرنا چاہتے تھے۔" اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے ذریعے اختیار کئے گئے۔ جنھیں ہم بجا طور پر شیطانی ذریعے کہہ سکتے ہیں۔ ان

---

[1] MEMOIRES SUR LES CARMATHES DU BEHARIN ET LES FATIMIDES, PAR M. J. DE GOEJE P.1 (LEIDE:— E. J. BRILL, 1886)

[2] ڈوزی، تاریخ مسلمانان اندلس، جلد ۲، ص ۸، حاشیہ۔

DOZY, HIST. LES MUSULMANS OF ESPANGE,

ہیں ہر قسم کی انسانی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ خوش اعتقادوں کے لئے عبادت کا جال بچھایا گیا۔ عیش پرستوں کے لئے آزاد روی بلکہ عیاشی کا، بلند خیالوں کے لئے فلسفۂ حکمت کا، زاہدوں کے لئے تصوف کا اور عوام کے لئے کشف و کرامات کا"۔[۱] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطانی قابلیت کے ساتھ "رائے عامہ کو فراہم" کرنے کے مسلم ترین طریقے اختیار کئے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے مخبر اور داعی پھیلا رکھے تھے۔ وہ ہر طریقے سے اس عقیدہ کو استوار کرتے تھے کہ مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اور دعوت دیتے تھے کہ جیسے ہی اس کا ظہور ہو سب لوگ ہتھیار اُٹھانے کے لئے تیار رہیں۔ انھوں نے ایک خفیہ جماعت قائم کی تھی اور اس خفیہ جماعت میں محرم اسرار ہونے کے مختلف مدارج قائم کئے گئے تھے۔[۲] تمام مذاہب کے عقائد و المیہ کے ہتھیاروں کی حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے۔ جوش و خروش اور موجودہ حالت سے غیر مطمئن ہونے کے لئے بار بار اپیل کی جاتی تھی اور ایسے دلیلیں پیش کی جاتی تھیں جن میں لوگوں کی عقل و فہم اور ان کے جذبات سے خطاب کیا جاتا

---

[۱] ۔ ایم، دخوئے، محولۂ بالا کتاب، ص ۳ ۔

M. J. DE GOEJE, OP CIT P. 3.

[۲] ڈوزی، محولۂ بالا کتاب، ص ۸، حاشیہ۔

تھا۔ فراست کی ہنر مندی ایک زبردست مجرمانہ تنظیم کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی تھی[1]۔ بنو علی کے دعوے اس غرض سے استعمال نہیں کئے جا رہے تھے کہ سازش کرنے والے کسی مقدس حق یا خلافت پر ایمان رکھتے تھے۔ بلکہ یہ دعاوی عوام کو اُبھارنے کا سب سے آسان ذریعہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن میمون کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے دو بیٹے اس فرقہ کے امام کی حیثیت سے اس کے جانشین ہوئے۔ ابن میمون کا چوتھا بیٹا حسین باپ کے سامنے ہی گذر گیا تھا۔ حسین کی اولاد میں ایک لڑکا سعید ابن حسین ابن عبد اللہ اپنے چچاؤں کے مرنے کے بعد اس فرقہ کا امام بنا۔ عبد اللہ ابن میمون نے حضرت علی کے حامیوں میں اپنا رتبہ بڑھانے کے لئے اپنے آپ کو علوی مشہور کر رکھا تھا۔ اس کے پوتے سعید ابن حسین نے ایسا ہی طرز عمل اختیار کرکے منتظرہ مہدی ہونے کا دعویٰ کیا[2]۔ اس کے داعیوں میں ابو عبد اللہ نامی ایک شخص تھا۔ یہ شخص مکہ میں کچھ دن رہنے کے بعد چند بربر حاجیوں کے ساتھ سنہ ۸۹۳ء میں شمالی افریقہ واپس آیا۔ بربروں کے ایک طاقتور قبیلہ قطامہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور بہت جلد اس نے ان لوگوں

---

[1] تاریخ مصر، اسٹینلی لین پول، ص ۹۴

[2] دیکھئے ایم، دخوئے۔ حوالۂ بالا۔

میں اپنا غیر معمولی اثر و نفوذ پیدا کر لیا۔ بربر کبھی خلافت کے زیر فرمان نہیں رہے۔ اور وہ اغالبہ (جس سے قیروان کی جامع مسجد کے بانی تعلق رکھتے تھے) کے تحت آزاد تھے۔ لیکن بعد کے اغالبی حکمرانوں کی زیادتیوں نے رعایا کو برگشتہ کر دیا تھا، اور اب ملک انقلاب کے لئے تیار تھا۔[۱] چند ہی سالوں میں سعید ابن حسین کے داعی ابو عبد اللہ نے (۲۰۰،۰۰۰) مسلح پیرو پیدا کر لئے اور سنہ ۹۰۸ء میں کئی مسلسل جنگوں کے بعد اس نے آخری اغالبی حکمران کو ملک سے نکال باہر کیا۔[۲] اب سعید ابن حسین (ابو عبد اللہ کے امام) کے لئے راستہ صاف ہو گیا تو اس نے عبید اللہ المہدی کا نام اور لقب اختیار کیا۔[۳] پھر حضرت علی اور بنت رسول حضرت فاطمہ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ جائز خلیفہ کی حیثیت سے اس کی خلافت کی بیعت ہوئی اور مسجد قیروان میں امیر المومنین کی حیثیت سے اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بنی عباس نے اعلان کیا کہ عبید اللہ المہدی ماں کی طرف سے یہودی النسل ہے۔ ابو عبد اللہ ہمارے زمانے کے بالشوک داعیوں کا ابتدائی نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ

---

[۱]۔ تاریخ مصر، از لین پول۔ ص ۹۵۔

[۲] اسٹینلی لین پول۔ حوالۂ بالا۔

[۳] ایم خوے، حوالۂ بالا۔

عبید اللہ کو مہدی اور پہلا فاطمی خلیفہ بنا تو دیا، لیکن اس سے خود اس کی ذات کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اس کے لئے فاطمی دعوت اپنے حصول مقصد کا ایک ذریعہ تھی۔ اسے توقع تھی کہ عبید اللہ اپنے فلسفہ کو اپنے آخری حدود تک پہنچائے گا۔ اسلام کو نیست و نابود کر کے زن و زمین کو مشترک میراث قرار دے گا۔ اور تمام لذتوں کے حصول کو بے قید و بند بنا کر ایک مکمل معاشرتی اور سیاسی افراتفری پیدا کر دے گا[1] اس کے برعکس اب جب کہ عبید اللہ المہدی نے اپنے آپ کو صاحب اقتدار پایا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے افراتفری کے اس پروپیگنڈے کی ہمت افزائی نہ کرنی ہی مناسب سمجھی۔ حالانکہ اسی پروپیگنڈے نے اسے صاحب اقتدار بنایا تھا۔ لیکن اب اس کی ہمت افزائی کر کے وہ اپنے اقتدار کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر اس کے سابق داعی نے اس سے دغا کرنے کی ٹھانی اور مہدی کی اصلیت کے بارے میں شبہات پیدا کرنے شروع کئے۔ لوگ بس ایک اشارہ کا انتظار کرنے لگے۔ جب حالات بہت ہی نازک ہونے لگے تو مہدی نے اپنے داعی اور سابق ساتھی کو قتل کر کے ان سے یکسوئی حاصل کر لی۔

---

[1] اسٹینلی لین پول۔ حوالۂ بالا۔

پہلے فاطمی خلیفہ نے اپنا اقتدار مصر کی سرحدوں سے لے کر مراکش کے شہر فذ تک قائم کرلیا۔ صقلیہ کے مسلمان والی نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد فاطمی خلیفہ نے مصر کے خلاف ایک مہم روانہ کی۔ یہ مہم ناکام رہی مصر سے لوٹتے ہوئے اس کی فوجیں اپنے ساتھ طاعون کی وبا لیتی آئیں۔ طاعون اور قحط سالی سے ملک میں جابجا شورشیں بپا ہونے لگیں۔ اس کے دور حکومت کے آخری سال ان شورشوں کو دبانے میں صرف ہوئے۔ اس نے نہایت سختی سے نئے "مشرقی عقیدے" ـــــ یہ نام فاطمی (شیعی) عقائد کو دیا گیا تھا ـــــ کو پھیلایا۔ مقتول داعی کی کوششوں سے بڑے بڑے شہروں میں جو بہت سے "آزادخیال" پیدا ہوگئے تھے ان کو سختی سے دبایا گیا۔ ظاہر میں مہدی ایک پکا مسلمان تھا۔ اور جب کبھی قیروان کے باشندوں نے اپنے استاد کے بتائے ہوئے "ترقی پسند" نظریوں پر عمل کرنا یعنی اسلام کے قوانین کا مضحکہ اُڑانا، بے روک ٹوک عاشقی کرنا، شراب پینا اور سور کا گوشت کھانا چاہا تو انھیں ایسے کاموں سے سختی کے ساتھ روکا گیا[۵] مہدی کے بعد اس کا بڑا بیٹا القائم (۹۳۴ ـ ۹۴۶) اس کا جانشین ہوا۔

---

۵ اسٹینلی لین پول، ص ۹۷ ـ

اس نے فرانس کے جنوبی ساحل پر یورش کی، جنیوا کی ناکہ بندی کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کلابیریا (Calabria) کے ساحل پر چھاپے مارے، بہتوں کو قتل کیا اور بہتوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے مصر کے خلاف ایک فوج روانہ کی اور سخت ہزیمت اٹھائی۔
چوتھا فاطمی خلیفہ المعیز (۹۵۲ء — ۹۷۵ء) ایک لائق اور قابل آدمی تھا۔ وہ عربی، یونانی، بربر اور مختلف سوڈانی زبانیں حتیٰ کہ سالوامک (Salvamic) زبان تک جانتا تھا۔ بظاہر وہ بھی پکا مسلمان تھا۔ اس کا وزیر اعظم مشرقی مملکت کا ایک غلام جوہر — یا جیسا تاریخوں میں اسے جوہر "رومی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جوہر رومی تھا۔ المعیز نے جوہر کو اپنی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ بحر اوقیانوس سے لے کر مصر کی سرحد تک پورے شمالی افریقہ کو پرسکون بنانے اور عرب اور بربر دونوں قوموں کو پوری طرح زیر کرنے کے بعد فاطمی خلیفہ نے مصر کو فتح کرنے کی ٹھانی۔ اس ملک کی حالت سے وہ یعقوب ابن قلیس نامی ایک غدّار یہودی کے ذریعہ ہمیشہ واقف رہتا تھا۔ سنہ ۹۶۷ء میں اسے معلوم ہوا کہ مصر کے لوگ غیر مطمئن ہیں، فوج بغاوت پر تلی ہوئی ہے نیل میں طغیانی نہ آنے سے قحط پڑا ہے، طاعون بھی پھیلا ہوا ہے۔ اور بدنصیب اہل مصر ترک وطن کر رہے ہے

ہیں۔ یہودی یعقوب کو جب مصر سے نکال دیا گیا تو اس وقت تک وہ ملک کی سیاسی اور مالی حالت سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس نے جو خبریں پہنچائیں اس سے فاطمی خلیفہ نے جو پہلے ہی سے سڑکوں پر کنوئیں کھدا کر اور رقمیں جمع کر کے مصر پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا، اب مصر پر حملہ کا پکا ارادہ کرلیا۔ فروری سنہ ۹۶۹ء میں اس کا سپہ سالار جوہر قیروان سے روانہ ہوا اور ۱۵ر اگست کو فاطمی فوج نے مصر کے دارالحکومت فسطاط پر قبضہ کر لیا۔ اسی رات جوہر نے ایک نئے شہر یا ایک قلعہ بند محل کی بنیاد کھدوائی۔ اس کے لئے جو مقام منتخب کیا گیا تھا وہ فسطاط کے شمال مشرق میں اور دریائے نیل سے ایک میل پر ایک ریگ زار تھا۔ خلیفہ المعیز نے پہلے ہی سے جوہر کو اس مقام کی نشان دہی کر دی تھی اور جیزہ سے دریا کو پار کرتے ہی جوہر اور اس کی فوج نے اس پر مقام کیا۔ المقریزی کا بیان ہے کہ یہ وہی مقام ہے جس پر اس وقت قاہرہ بسا ہوا ہے۔ مقریزی آگے بیان کرتا ہے کہ فصیل کے اندر ایک مسجد اور ایک محل یا ایک قلعہ تھا اور یہ عمارتیں اینٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ مقام المنصوریہ کہلاتا تھا، یہاں تک کہ المعیز نے مشرق سے آنے کے بعد اسے قاہرہ کا نام دیا۔" اور" ــــ یہ مقریزی کا بیان ہے ــــ "کہا جاتا ہے کہ شہر کو یہ نام دینے کی وجہ یہ تھی جو

ذیل میں بیان کی گئی ہے : جب سپہ سالار جوہر نے شہر کے بنانے کا ارادہ کیا تو اس نے منجمون کو طلب کیا، اور انھیں بتایا کہ وہ شہر مصر (یعنی اس وقت کے دارالحکومت فسطاط) کے باہر ایک شہر تعمیر کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں فوج رہ سکے ، اور حکم دیا کہ اس کی بنیاد رکھنے کے لئے کوئی سعید وقت مقرر کیا جائے جو اس بات کا ضامن ہو کہ یہ مقام اس کے اور اس کی اولاد کے قبضہ سے کبھی نہیں نکلے گا۔ منجمون نے بنیاد رکھنے اور بنیادیں بھرنے کے لئے ایک خاص وقت مقرر کیا۔ اور انھوں نے اس مقام کے گرد لکڑی کے کھمبے گاڑ دئے۔ ان کھمبوں میں ایک رسّی باندھ دی گئی اور اس پر گھنٹیاں لگائی گئیں۔ انھوں نے مزدوروں سے کہا "جب گھنٹیاں بجیں تو تمہارے ہاتھوں میں مٹّی پتھر جو کچھ بھی ہو (ان خندقوں میں جو بنیاد کے لئے کھود کر تیار رکھی گئی تھیں) پھینک دو۔" اب وہ اس نیک گھڑی کا انتظار کرتے کھڑے رہے اتنے میں ایسا ہوا کہ ایک کوّا آکر اس رسّی پر بیٹھ گیا۔ جس سے گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں ۔ اس سے تمام گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اور مزدوروں نے سمجھا کہ انھیں منجموں نے بجایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو کچھ مٹّی اور پتھر ان کے ہاتھ میں تھا خندقوں میں پھینکنا شروع کیا اور تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ منجم چلّائے " القاہر (فتح مند) طلوع ہو رہا

ہے۔" اس طرح وہ جو ان کا ارادہ تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ صبح کا فتح مند ستارہ مریخ تھا جو اس کی بنیادیں رکھتے وقت طلوع ہو رہا تھا چنانچہ انھوں نے اس شہر کا نام قاہرہ (فتح مند) رکھا اور وہ اپنے اس شگون میں سچے تھے کیونکہ یہ شہر آج تک بھی ناقابل تسخیر ہے۔[۱]

---

[۱] المقریزی، ج ۱، ص ۳۷۷

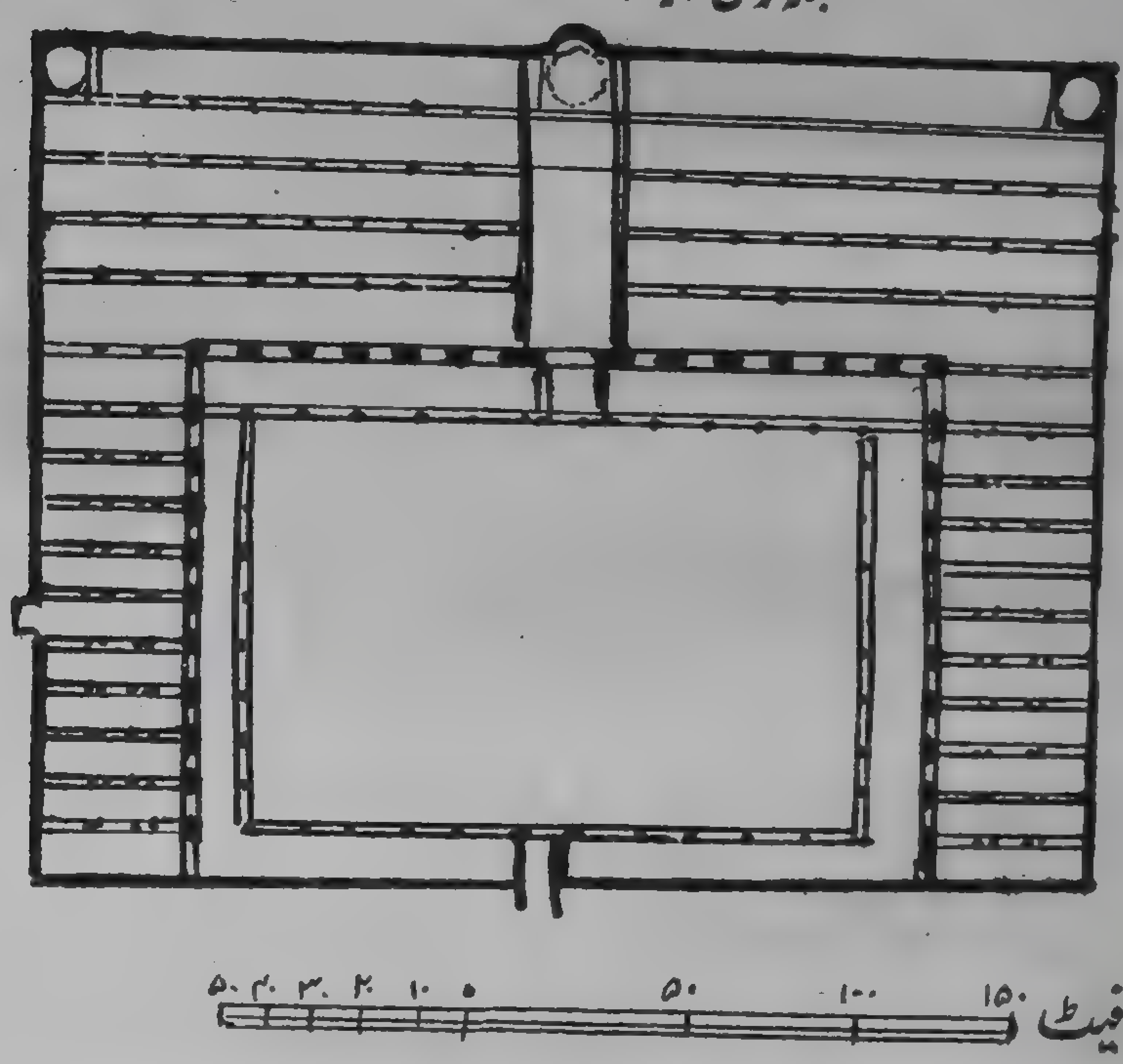
چوتھا باب

فاطمی اور ایوبی دور

وہ مسجد جو قاہرہ کی شہر پناہ کے اندر بنائی گئی تھی، اب مشہور زمانہ جامعہ ازہر ہے۔ فاطمی خلفائے کے عہد میں بھی اور ان کے بعد سے آج تک بھی اس میں بہت سی تبدیلیاں، مرمتیں، اور اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصل مسجد کا حجم اور اس کی وضع کو متعین کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ مسجد کوئی دو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی مسافت عرض میں (۲۰۰) فیٹ اور طول میں (۲۵۰) فیٹ تھی۔ اسے ایک خشتی دیوار کے ذریعہ محصور کیا گیا تھا۔ مستطیل کا بڑا ضلع مکّہ کے مقابل تھا۔ قاہرہ کی مسجدوں کی ٹھیک سمتوں کے بیان میں مقامی طریقہ کو اختیار کرنا سہولت بخش ہے۔ یعنی اگرچہ مسجد تقریباً بالکل جنوب مشرق میں واقع ہے، لیکن قبلہ کی دیوار کو جنوب مشرقی دیوار نہیں بلکہ مشرقی دیوار کہنے اور اسی طرح دوسری دیواروں کی سمتوں کو بیان کرنے میں آسانی ہوتی ہے ازہر کا حرم اگرچہ قیروان کی جامع مسجد (اس جامع مسجد

سے بنی فاطمہ بہت اچھی طرح واقف تھے) سے عمق میں کم ہے، تاہم کئی باتوں میں دونوں کا نقشہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح اور باتوں میں یہ مسجد اس مصری وضع سے مشابہت رکھتی ہے جس کی نمائندگی ابن طولون کی مسجد کرتی ہے۔ قیروان کی مسجد کی طرح اس میں بھی محراب تک وسطی دالان بنا ہوا ہے۔ وسطی دالان کے ہر دو جانب دہرے ستونوں کے چھتّے کا حاشیہ ہے۔ محراب کے مقابل جو جگہ ہے اس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔ قیروان کی طرح یہاں بھی حرم کے سامنے ایک ڈیوڑھی ہے۔ یہ ڈیوڑھی مسجد کو حرم اور صحن میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس ڈیوڑھی کے درمیانی کھانچے پر ایک گنبد ہے۔ وسطی دالان کے حاشیے کے چھتّوں کے سوا حرم کے بقیہ چھتّے اس ترتیب سے بنائے گئے ہیں کہ وہ جامع ابن طولون کی طرح دیوار قبلہ کے متوازی جاتے ہیں اور قیروان کی مسجد کی طرح اس سے زاویہ قائمہ نہیں بناتے۔ ابن طولون کی مسجد کی طرح اس حرم میں ایسے پانچ چھتّے تھے، لیکن جامع ازہر میں پانچواں چھتا ایک مقصورے یا اوٹ کے ذریعہ بند کر دیا گیا ہے جو اسے ڈیوڑھی سے الگ کر دیتا ہے۔ وہ چھتّے جو اب اصل محراب کے مشرق میں ہیں، اٹھارویں صدی میں بڑھائے گئے ہیں۔ حرم کے چھتّے قدیم ستونوں اور سرستونوں پر مشتمل ہیں۔ ان پر اس

شکل کی نکیلی کمانیں اٹھائی گئی ہیں جسے ایرانی کہا جاتا ہے۔
یہاں اس شکل کی کمان پہلی بار نمودار ہوئی ہے۔ یا کم از کم
یہ اس کی قدیم ترین باقی ماندہ مثال ہے۔ پانچویں چھٹے
میں ستونوں کی جگہ پائے استعمال کیئے گئے ہیں، کیونکہ جیسا
کہ ولید کی جامع دمشق کے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے،



شکل ۲۱ ازہر کا قیاسی نقشہ، العزیز کی ترمیم کے بعد

ستونوں کی بہ نسبت پایوں کے درمیان اوٹ بنانا آسان ہے۔
اس مسجد کی ڈیوڑھی میں ہر سمت سے داخل ہو سکتے ہیں،
چاہے صحن میں سے چاہے بازوں کے ایوانوں سے۔ یہ
ایوان شمالاً اور جنوباً بنائے گئے ہیں۔ پھر انھیں ایک ادم
ایوان سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ایوان مغربی دیوار کے محاذی

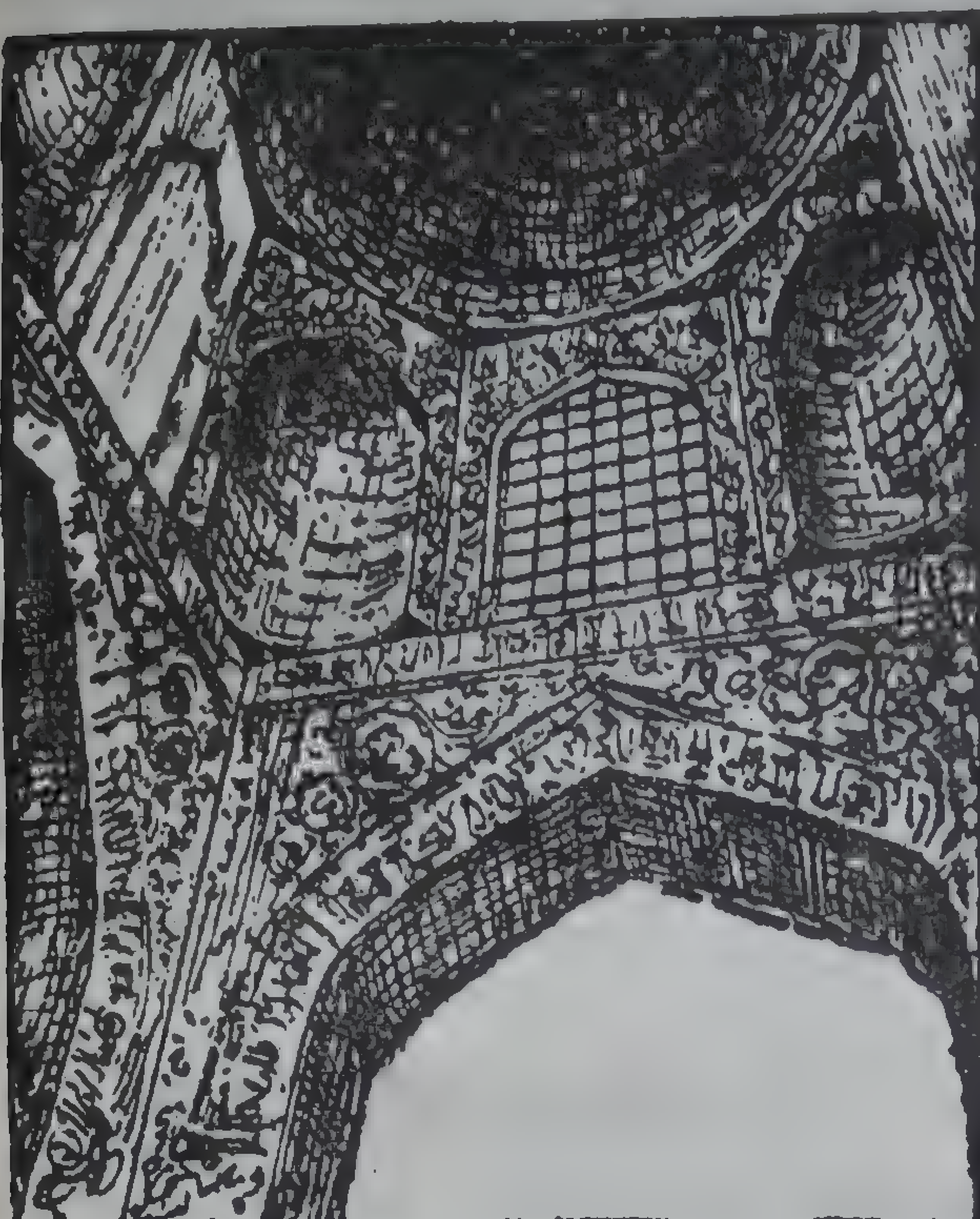
بنایا گیا ہے اور اس میں مسجد میں داخل ہونے کا صدر دروازہ نکالا گیا ہے۔ شمالی اور جنوبی ایوانوں کے شمال اور جنوب میں ویسے ہی پائے ہیں جیسے کہ ڈیوڑھی کو حرم سے جدا کرنے والے پائے ہیں۔ ان پایوں کے درمیان بھی ایک اوٹ دیوار بنائی گئی ہے۔ یہ اوٹ دیوار ایوان کو ان کشادہ جگہوں سے جو طالب علموں کی رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے، اولٹوں اور ترتیب وار شمالی اور جنوبی دیواروں سے بننے والے رقبوں کو الگ کردیتی ہے۔ (شکل ۲۱) ان جگہوں کی چھت نو چھتّوں پر اُٹھائی گئی ہے۔ یہ چھتّے دیوار قبلہ کے متوازی بنائے گئے ہیں۔ ہر چھتّے میں تین کمانیں ہیں، اور یہ کمانیں جوڑی دار ستونوں پر اُٹھائی گئی ہیں۔ المعیز نے اصل میں یہ مسجد جامعہ کے لئے نہیں بنائی تھی، بلکہ اسے اپنی فوجوں کی عبادت گاہ کے طور پر بنایا تھا۔ اس کے جانشین العزیز (۹۷۵ - ۹۹۶ء) نے اسے عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ مقام درس و تدریس بھی بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس وقت کے سُنّی مصریں لوگوں کو شیعہ عقیدوں سے واقف کرانے کا ذریعہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اصل مسجد میں شمالی اور جنوبی سمتوں کے ایوان بلا شبہہ شمالی اور جنوبی دیواروں کے محاذی بنائے گئے تھے۔ طالب علموں کے لئے جائے رہائش نکالنے

کے لئے العزیز نے غالباً شمالی چھتّوں میں جنوباً اور شمالی چھتّوں میں شمالاً تین تین کھانچے بڑھا کر صحن کے حجم کو گھٹا دیا، اور اس طرح جو جگہ نکلی اس میں طالب علموں کے رہنے کے لئے چھتّے بنوائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ چھتّے جو آج اپنے دہرے ستونوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں، العزیز کے عہد کے بعد دوبارہ تعمیر کا نتیجہ ہوں۔ لیکن ان کے بنانے کا خیال العزیز کے اس فیصلہ سے پیدا ہوا ہے کہ اس مسجد کو درسی اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔

المقریزی کی ایک عبارت [۷] سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداً حرم کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک گنبد تھا۔ بے شبہہ شمال مشرقی گوشے میں اس گنبد کا جواب بھی بنایا گیا تھا۔ الحاکم کی بنائی ہوئی مسجد میں جو کچھ دنوں بعد بنی ہے، ایسے ہی دو گنبد ہیں۔ یہ ایک فاطمی جدّت ہے۔ جامع ازہر میں ایک مربع زیریں تعمیر کو ایک مدور گنبد میں تبدیل کرنے سے ایک ایسے طریقے کی مثال ملتی ہے جس کا وجود فاطمی عہد سے پہلے کہیں نہیں تھا۔ یہ (شکل ۲۲) ایک کمان دار محراب ہے۔ اس میں کمانیں زاویوں کے اطراف اٹھائی گئی ہیں۔ مشہور اطالوی عالم اور ماہر آثار قدیمہ سنورا ریویرا نے اسلامی فن تعمیر پر اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ اس طریقہ کی اولین معلومہ مثال

۷ مقریزی، ج ۲، ص ۲۷۲، میرا خیال ہے کہ اس کی طرف پہلی مرتبہ ک، اے، سی، کرسول نے توجہ دلائی ہے۔

راوینا (Ravenna) کے مقام پر سان وٹیل کے کلیسا (San Vittale) میں پائی جاتی ہے، اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے یہ طریقہ اطالیہ سے مصر میں مروج ہوا ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دسویں صدی کے نصف آخر سے مشرق کی تجارت وینس پیسا اور المالفی کے ہاتھوں میں آگئی تھی، ان



شکل ۲۲ جامع ازہر میں گنبد کا صعود

تعلقات نے ممکن ہے اسلامی فن تعمیر کو متاثر کیا ہو اور ممکن ہے نصرانی فن تعمیر میں تکملی طرز کو تیزی سے رواج دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح صعود کے طور پر کمان دار محراب استعمال کرنے کا کوئی مشرقی ماخذ نہیں مل سکا ہے۔

ازہر کی خشتی دیواروں اور کمانوں پر استرکاری کی خوب موٹی تہہ چڑھائی گئی تھی۔ اس میں کتبے اور آرائشی

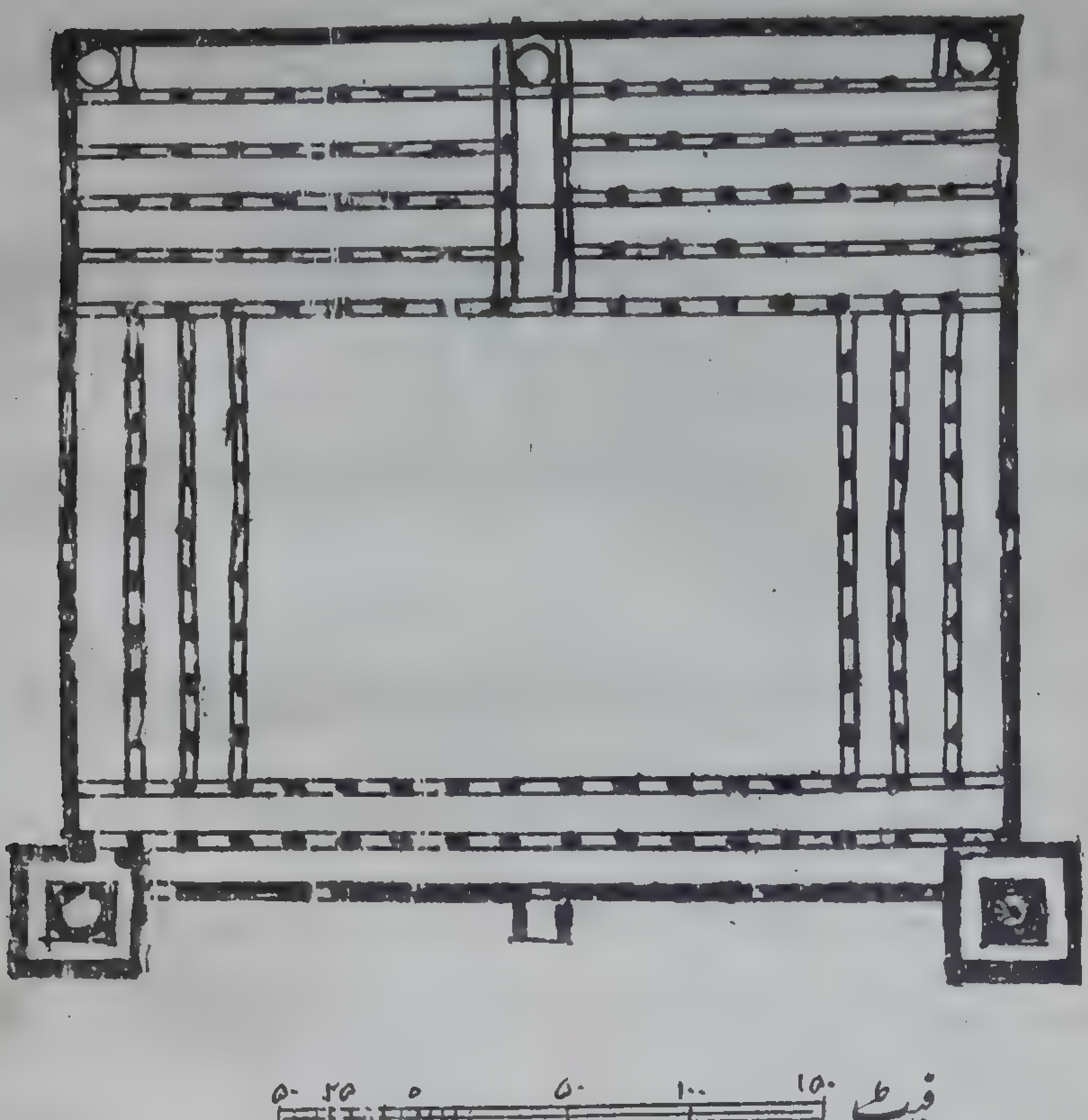
چیزیں کندہ کی گئی تھیں۔ اس طرح فاطمیوں کے عہد میں اس وقت تک بھی اینٹ تعمیری مسالہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھی اور اس وقت تک کا فن تعمیر خشتی فن تعمیر تھا۔ یہ فن تعمیر بحر روم کے فن تعمیر سے زیادہ ایشیائی فن تعمیر ہے۔ اور اس کی اصل گیلی مٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں تعمیر کاری کا انحصار اسی پر رہا ہے۔ اور یہ اس وقت تک برابر استعمال ہوتی رہی جب تک کہ تزئین کے لئے استرکاری اور روغنی مٹی میسر نہ ہوئی۔

سنہ ۹۹۱ ء میں المعیز کے جانشین العزیز نے اس مسجد کی بنیاد رکھی جو اس کے جانشین الحاکم کے نام سے منسوب ہے۔ الحاکم نے اس مسجد کو سنہ ۱۰۱۲ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ مسجد اس وقت ویران پڑی ہے، لیکن اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں۔ یہ مسجد اس زمانہ کی شہر پناہ کے باہر تھی، لیکن اب یہ اس کے اندر ہے کیونکہ بعد میں شہر کے پھیلاو نے اسے شہر پناہ کے اندر لے لیا ہے۔ اس کی مساحت (۳۸۰) فیٹ ضرب (۳۶۵) فیٹ ہے۔ اور یہ تقریباً ساڑھے تین ایکڑ رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بانی نے اس کا جو حجم سوچا تھا اس کی وجہ سے اس کا شہر پناہ کے اندر بنانا ممکن نہ تھا۔ حرم (شکل ۲۳) پانچ کھانچوں تک عمیق بنایا گیا ہے۔ اس کا چھت چھتوں پر اُٹھایا گیا ہے۔ یہ چھتے ابن طولون اور

ازہر کی مسجدوں کی طرح دیوار قبلہ کے متوازی چلے گئے ہیں شمالی اور جنوبی سمتوں پر بنے ہوئے بازو کے ایوان تین کھانچوں تک عمیق ہیں۔ اور مغربی ایوان دو کھانچوں تک عمیق ہے۔ چھتیں خشتی پایوں پر بنائے گئے ہیں، اور ان پر کسی قدر گھوڑ نعلی وضع کی نکیلی کمانیں بنائی گئی ہیں۔ یہاں چوبی گردنے اور شہتیری جوڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ محراب کے آگے کی جگہ کے اوپر ایک گنبد ہے اور ایک گنبد (جو اب گر پڑا ہے) حرم کے شمال مغربی گوشے پر بنایا گیا تھا۔ اس گنبد کا جواب شمال مشرقی گوشے پر بنایا گیا تھا۔ گنبدوں کی یہ ترتیب بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ ابتداء میں جامع ازہر میں اختیار کی گئی تھی۔ ازہر کی طرح محراب کا گنبد تین کمانوں اور قبلہ کی دیوار پر اُٹھایا گیا ہے۔ گوشوں پر بنی ہوئی چار کمانوں کے ذریعہ مربع زیریں تعمیر مثمن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مغربی دیوار میں پتھر کا ایک شاندار دروازہ ہے۔ یہ ایک نیا اضافہ ہے۔ اس پر بیل بوٹوں کا نہایت باریک کام کندہ ہے۔ شمال مغربی اور جنوب مغربی گوشوں پر احاطہ کی دیواریں دو اُبھار سے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا نقشہ مربع ہے۔ یہ شرقاً احاطے کے اندر ہی مغربی ایوان کے ایک بغلی دالان کے برابر عمیق ہیں اور شمالاً (جنوبی اُبھار) اور

جنوباً (شمالی اُبھار) ان ایوانوں کے ایک بغلی دالان سے
بھی زیادہ عمیق ہیں۔ ایوانوں کے دروازوں کے اندر سے
اُبھاروں میں جانے کا راستہ بنایا گیا ہے۔ اُبھاروں کے
اندرونی حصّہ کی مساحت پچاس فیٹ ہے۔ اس میں نہایت
عمدہ گھڑے ہوئے پتھروں سے مینار بنائے گئے ہیں۔
شمالی مینار اپنی بنیاد کے پاس مربع ہے، اس کے بعد
یہ استوانہ نما ہو گیا ہے۔ جنوبی مینار کی ابتداء بھی مربع
نقشے سے ہوتی ہے اور نصف کے قریب جاکر وہ
مثمن ہو جاتا ہے۔ پتھر کی زیریں تعمیروں پر اینٹ
کی بنی ہوئی موجودہ منزلیں بعد کی ہیں۔ اصلی سنگی مینار
کس طرح ختم ہوتے تھے اس کا علم نہیں ہے۔ بے شبہہ
وہ بھی اینٹ کے کام پر ہی ختم ہوتے ہوں گے۔ یہ
مینار سنہ ۱۲۰۲ء کے زبردست زلزلے میں گر پڑے۔
پتھر کے اصل میناروں کے اندر گھومتے زینے ہیں۔ ان
زینوں کو مثلثی دریچوں کے ذریعہ روشن کیا گیا ہے۔
کوفی کتبوں کی پٹیوں سے میناروں کی تزئین کی گئی ہے
بعض دریچوں کے موکھوں میں اصلی پتھر کی جالیاں ہیں،
ان جالیوں میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے شمس پہلی
ستاروں (نام نہاد سپر داؤد) کی وضع کے ہندسی نمونے
کاٹے گئے ہیں۔ اس وضع کی اوّلین مثال فلسطین میں
بمقام (Capernaum) دوسری صدی کی ایک یہودی

صلوات کی سرول پر ملی ہے۔ اس کے سوا یہ شکل فرامشن (MASNIC) کی ایک مشہور علامت ہے، اور اب یہودی قومی تحریک کے نشان کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ ایک اسلامی عمارت میں اسے بطور تزئین استعمال کرنے



شکل ۲۳ الحاکم کی ویران مسجد کا قیاسی نقشہ

کی یہی ایک مثال ہے دین خلیفہ الحاکم کی بنائی مسجد میں پائی جاتی ہے۔ مسجد کی بیرونی دیوار کا بیرونی رُخ ترشے ہوئے پتھر کا ہے۔ اور اسے (جو کچھ تھوڑا بہت

ؔ مصنف سے ک، ا، س، کرسول کے ایک بیان کے مطابق۔

حصّہ اس کا باقی رہ گیا ہے) کوفی کتبوں سے مزین کیا گیا ہے، اندرونی رُخ روڑے کا ہے اور استر کار خشتی پایوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے اس پر بھی استر کاری کی گئی ہے۔ استر کاری، جو اب غائب ہو گئی ہے، بے شبہہ جامع ازہر کی طرح بیل بوٹوں سے مزین اور کتبوں کی پٹیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان پر سونے کے پتر اور رنگ چڑھائے گئے تھے۔ اُجڑی ہوئی مسجد کی موجودہ یاس انگیز ویرانی سے اس کی گذشتہ استر کاری میں کندہ نازک تزئین اور رنگ کاری کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ ازہر کی خشتی مسجد اور الحاکم کی بیشتر سنگی مسجد کی تعمیر کے دوران میں ایک اہم تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ یہ سنگ کاری نہایت اعلیٰ درجے کی سنگ کاری ہے اور گل بوٹوں اور کتبوں کی کندہ کاری سے مزین ہے۔ یہ صناع جنھوں نے یہ کام کیا ہے اپنے پیچھے طویل روایتیں رکھتے تھے۔ اگر ایسے صناع ابن طولون اور المعز کے زمانہ میں مصر میں ہوتے تو ضرور کام پر لگائے جاتے۔ یہ لوگ المعز کے عہد میں کچھ سالوں تک اور العزیز (جس کے عہد میں الحاکم کی مسجد کی ابتداء ہوئی) کے عہد میں کچھ سالوں تک مصر نہ آسکے ہوں گے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ باہر

سے آئے تھے۔ ممکن ہے شام سے آئے ہوں۔ لیکن زیادہ اغلب یہ ہے کہ یہ لوگ شمالی مسوپٹیمیا کے علاقہ دیار بکر کے نواح اور اس کے قریب کے علاقوں سے آئے ہوں گے۔ اگر یہ شام سے آئے ہوتے تو اغلب یہ ہے کہ مینار مدور یا مثمنی ہونے کی بجائے مربع شکل کے ہوتے جو پتھر کی بہ نسبت خشتی اصل کی شکلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قیاسات کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ جامع الحاکم کے میناروں کی تعمیر میں جو سنگ راج لگائے گئے تھے وہ ایسے سنگی تعمیر کے ملک سے آئے تھے جس کا خشتی تعمیر کے ملک سے قریبی تعلق تھا۔ شمالی مسوپٹیمیا کا ملک ان سب خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ سنگ راج کس طرح قاہرہ آئے غالباً انھیں العزیز نے درآمد کیا تھا۔ العزیز ہی نے اس مسجد کی ابتداء کی تھی، اور اسی کے عہد میں فاطمی سلطنت اپنے انتہائی حدود کو پہنچی اور شمالی مسوپٹیمیا تک پھیل گئی تھی۔

الحاکم کی مسجد چھتّے دار حرم اور ایوانوں اور ایک وسیع کھلے صحن کے ساتھ تقریباً آخری بڑی چوگوشہ جامع مسجد تھی۔ اس قسم کی مسجد کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے جیسے "مسجد الجمعہ"، "مسجد الجمع" "مسجد الجامع"

یا صرف "الجامع"[1]۔ اس اصطلاح کو انگریزی زبان میں "Congagational Mosque" یا "جمعہ مسجد" کے ذریعہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

العزیز کے زمانے سے افریقہ کے تعلقات مصر سے کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اور شام کو تو محض فوجی قوت کے بل بوتے پر قبضہ میں رکھا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خطبہ میں العزیز کا نام بحر اوقیانوس سے لے کر بحر احمر تک، یمن، مکہ اور ایک بار تو دریائے دجلہ کے کنارے واقع موصل میں تک پڑھا جاتا تھا[2]۔ الحاکم کے عہد حکومت میں فاطمی خلافت شمالی افریقہ اور شام میں اور بھی متزلزل ہوگئی، اور خود مصر میں خلیفہ کی مجنونانہ بربریت کی وجہ سے خاندان خلافت ہی خطرے میں پڑ گیا۔ اس نے شیعی بدعت کی انتہائی تبلیغ اور ہر قسم کی آزاد خیالی کی ہمت افزائی کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے قاہرہ میں "دارالحکمۃ" کی بنیاد رکھی۔ یہ ایک طرح کا "گرانڈ لاج" (فرامشن وغیرہ کی مجلس انتظامیہ) تھا۔ اس میں محرمی کے نو درجے تھے۔ محرم کو جو کچھ سکھایا

---

[1] قاموس الاسلام، مقالہ "فن تعمیر" از فان برچم۔

DICTIONARY OF ISLAM, ARTICLE "ARCHITECTURE"

BY VON BERCHEM -

[2] اسٹینلی لین پول، محولۂ بالا کتاب، ص ۱۲۲

جاتا اس کا پوشیدہ رکھنا اس پر لازم تھا۔ ابتدائی درجوں میں اسلام کی اہم تعلیمات کے خلاف کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ لیکن پانچویں درجہ میں محرم کے دین کو متزلزل کیا جانے لگتا۔ اسے بتایا جاتا کہ تمام مذہبی رسوم محض ظواہر و مظاہر ہیں، اور ان کا مقصد عوام کو قابو میں رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد یہ تعلیم دی جاتی کہ اصل پیغمبر وہ ہیں جو عملی معاملات جیسے سیاسی اداروں اور حکومتی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ نویں درجے میں یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ کسی بھی مذہبی حکم کو ماننے کی ضرورت نہیں تاوقتیکہ اس کے بغیر نظم و ضبط برقرار رکھنا ضروری نہ ہو جائے۔ اس طرح الہامی مذہب پر ایقان کو برباد کر دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ قاہرہ کا دارالحکمت ایک نئے فرقے کا مرکز بن گیا۔ بدکار اور پاگل الحاکم نے تو یہ خیال کرنا شروع کیا کہ خود اس میں "حکمت ربانی" نے جنم لیا ہے۔ دارالحکمت کے ذریعہ اس عقیدے کو لوگوں کے ذہن نشین کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح مصر والوں پر بڑی زیادتیاں کی گئیں اور آخرکار الحاکم اپنی ایک تنہا شب گردی میں قتل ہو گیا۔ چند سالوں کے بعد ایک شخص نے اس بات کا اعتراف کر لیا۔ اس نے کہا کہ یہ کام اس نے "خدا اور اسلام کی محبت میں" کیا تھا۔[۵] دسویں صدی

[۵] اسٹینلی لین پول، محولۂ بالا کتاب، ص ۱۲۳

اور گیارھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اسلام کو برباد کرنے کے اس اقدام اور نصرانیت کو برباد کرنے کی جو علانیہ کوشش آج کل کی جارہی ہے اس میں ایک عجیب مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے سیاسی نقاط نظر، مقاصد اور طریقے ایک سے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا محرک جذبہ بھی ایک ہی ہے، یعنی ایک شیطانی اثر جو ہمیشہ دنیا میں موجود رہا ہے۔ یہ شیطانی اثر انسانوں کی کمزوریوں کو شکار کرنے کا خواہش مند ہے۔ اور ایسا کرنے کی اس میں بہت بڑی طاقت بھی موجود ہے۔ یہ سود خواروں کی ذہنیت ہے جو ایک بہت بڑے میدان عمل میں سرگرم کار ہے، اور انسانوں کو ان کی کمزوریوں کے ذریعہ جہنم کے عذاب کی طرف لے جاتی ہے۔

الحاکم کے بیٹے کے ایک مختصر دور حکومت کے بعد خلیفہ المستنصر کے ہاتھ میں زمام خلافت آئی۔ اس نے تقریباً ساٹھ سال تک حکومت کی۔ بغداد کے عباسی خلفاء کو اپنا حاکمانہ اقتدار کھوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ یہ صرف سنی مسلمانوں کے پیشوا بن کر رہ گئے تھے۔ حاکمانہ اقتدار ہر اس سپاہی کو حاصل ہو سکتا تھا جو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے تابع رکھ سکتا تھا۔ سنہ ۱۰۶۰ء سے کچھ پہلے ہی عباسی خلیفہ، آل بویہ نامی ایک طاقتور خاندان

کی حمایت میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب ان کی جگہ سنی مذہب کے ترک قبیلے سلجوق نے لے لی تھی۔ سلاجقہ جب پہلی مرتبہ ماوراء النہر سے نمودار ہوئے ہیں۔ تو اس وقت عباسی سلطنت کئی غیر مربوط صوبوں میں منقسم ہوکر زوال پذیر ہو چکی تھی۔ سلاجقہ نے افغانستان سے لے کر بحر روم تک اسلامی ایشیا کو ایک حکمران کے تحت متحد کر دیا۔ لیکن انھوں نے اس سے بھی زیادہ کام کیا۔ سلاجقہ نے بازنطینی سلطنت پر حملہ کیا۔ سنہ ۱۰۶۸ء میں الپ ارسلان نے آخرکار آرمینیا اور گرجستان کے صوبوں کو فتح کر لیا۔ اور سنہ ۱۰۷۴ء میں پورا ایشیائے کوچک سلاجقہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرح قدیم اور ممتاز ترین سنگی تعمیری روایات کا حامل ایک بہت بڑا علاقہ اسلام کے زیر اقتدار آگیا۔ اس واقعہ نے اسلامی فن تعمیر پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ مصر میں اس کے اثر کا مطالعہ نہایت اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۰۹۲ء میں ملک شاہ کے انتقال کے بعد سلاجقہ کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ہوکر چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گئی۔ اس کے مختلف صوبے باج گزار رئیسوں کے قبضے میں آئے۔ ان میں اسنقر کے حصے میں شام کا ملک اور دوسرے علاقے آئے۔ یہ شخص نورالدین کا دادا اور مشہور عالم سلطان صلاح الدین ایوبی کا پیش رو تھا۔

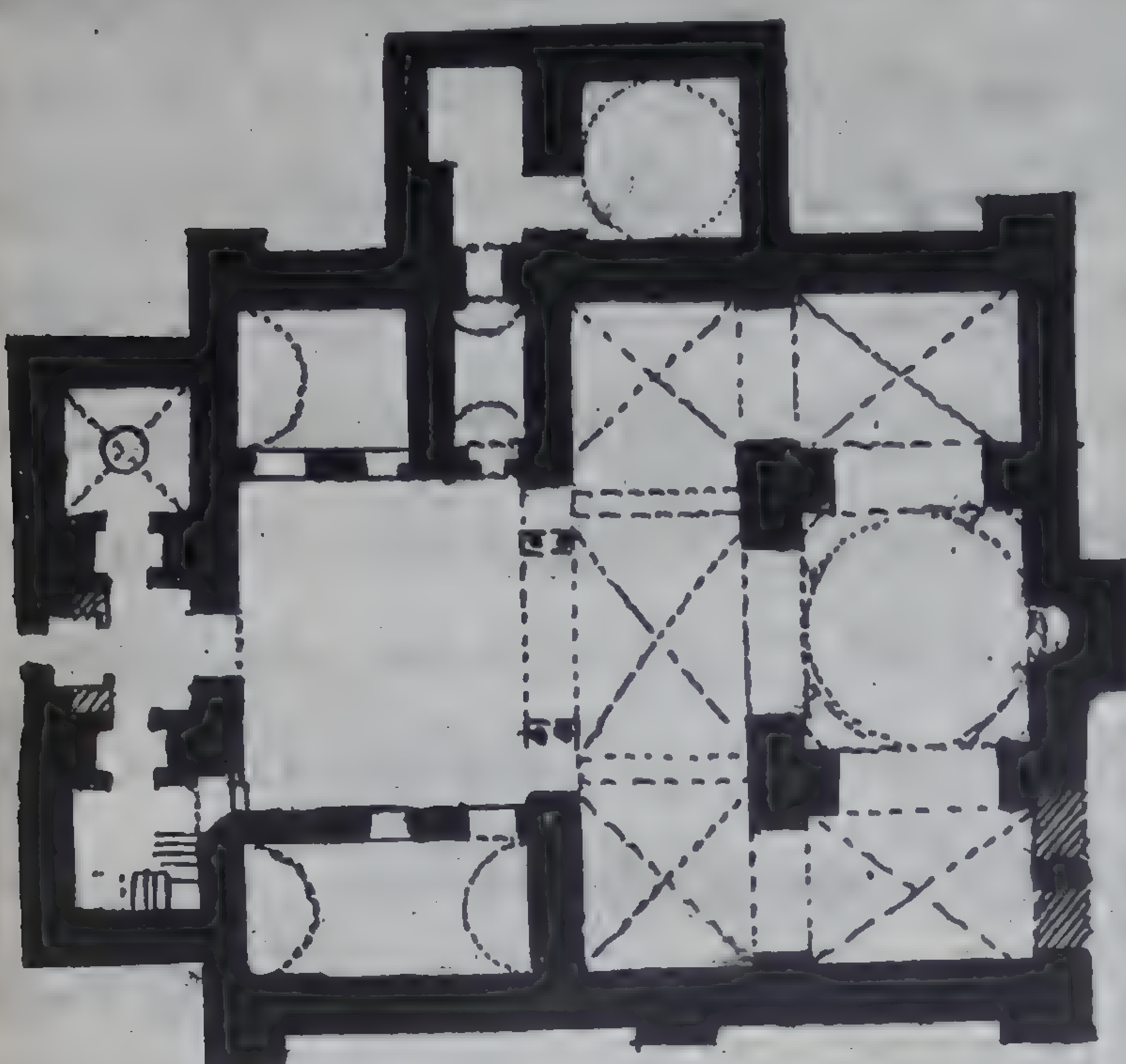
فاطمی خلیفہ المستنصر (۱۰۳۶ء – ۱۰۹۴ء) کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا علاقہ ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے مصری قوت بہت بڑی حد تک کمزور ہوگئی تھی۔ سلاجقہ سنہ ۱۰۷۱ء میں فلسطین کے لئے فاطمی خلافت سے دست بگریبان ہوگئے۔ اس کے پانچ سال بعد سلاجقہ نے دمشق پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد یہ شہر پھر کبھی فاطمیوں کے قبضے میں نہ آسکا۔ خود مصر میں خوش حالی گھٹتی گئی، اور خلیفہ کی ترکی، سوڈانی اور بربر فوجوں کے آپس کے رشک وحسد کی وجہ سے امن میں بڑا خلل پڑتا رہا۔ سنہ ۱۰۶۵ء میں نیل میں سیلاب نہ آیا۔ اس کے بعد قحط اور طاعون سے ملک کی بڑی بُری حالت ہوئی۔ شام کے ہاتھ سے نکلنے سے دو ایک سال پہلے خلیفہ نے اپنی سرکش فوجوں سے چھٹکارا پانے کی ایک تدبیر سوچی۔ اس نے عکہ واقع شام کے والی بدرالجمالی کو معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے بلایا، یہ شخص آرمینیا کا باشندہ تھا۔ بدرالجمالی نے لڑائیوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اور دو دفعہ دمشق کا والی رہ چکا تھا۔ اس نے مصری خلیفہ کے اس پیش کش کو اس شرط پر قبول کرلیا کہ وہ اپنے ساتھ اپنی شامی فوجیں بھی لاسکے گا۔ وہ سنہ ۱۰۹۴ء میں داخل قاہرہ ہوا۔ شکار کرنے کے لئے تمام ترکی جرنلوں کو شامی عہدہ داروں میں تقسیم کردیا گیا۔ اس طرح مختصر طور پر ترکی

فوجوں کی سرکشی کا خاتمہ ہو گیا۔

بدر الجمالی کو سپہ سالار یا امیر الجیوش مقرر کیا گیا۔ اس نے بربروں کو ڈیلٹا میں اور سوڈانیوں کو مصر اعلیٰ میں زیر کیا۔ اس کے تحت مصر میں پھر خوش حالی کا دور دورہ ہوا، اور العزیز کے عہد کے بعد سے قاہرہ پہلی مرتبہ تعمیر کاروں اور صناعوں کی آماجگاہ بن گیا۔ یہ صحیح ہے کہ فاطمی دور خلافت کی ابتداء میں جتنے بے شمار وسائل حاصل تھے، اب اتنے وسائل موجود نہ تھے۔ اور قابل حصول وسائل میں سے ایک بڑے حصّہ کو سلجوق خطرے کی بناء پر فوجی کاموں کے لئے مختص کرنا پڑا تھا۔ اب جو مسجدیں بنیں وہ چھوٹی تھیں۔ لیکن ان میں بہت سی دلچسپ چیزیں نمودار ہونے لگیں۔ ان میں سے چند نے جامع الجیوشی میں جگہ پائی۔ یہ مسجد قاہرہ سے آگے جبل قدم پر واقع ہے۔ دروازے پر کے ایک کتبہ کی رو سے اس مسجد کا سنہ تعمیر ۱۰۸۵ء ہے۔ یہ امیر الجیوش (سپہ سالار) بدر الجمالی کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا نقشہ (شکل ۲۴) مستطیلی ہے، اور اس کی مساحت ۵۰ × ۴۸ فیٹ ہے۔ باب الداخلہ مغربی سرے پر بنایا گیا ہے۔ یہاں وہ اصل عمارت سے لگا ہوا ایک مستطیل عمارت کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ شمال میں ایک اور عمارت اصل عمارت سے لگی ہوئی

ہے۔ اس عمارت کے اندر ایک قبر ہے۔ باب الداخلہ کی بائیں جانب ایک مربع کمرہ ہے۔ اس پر متقاطع لداؤ چھت ڈالی گئی ہے۔ اور اندر ایک کنواں بنایا گیا ہے۔ اس کی دائیں جانب ایک زینہ ہے۔ یہ زینہ چھت اور اس مینار پر جاتا ہے جو باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا ہے۔ باب الداخلہ کے کمرے سے گذرنے کے بعد ایک کھلا صحن ملتا ہے۔ اس کی دائیں جانب خادموں کے لئے لداؤ چھت کے کمرے ہیں۔ کمرے کے آگے بائیں جانب راستہ ہے۔ یہ راستہ اس گنبد والے کمرے کی طرف جاتا ہے جس میں متذکرہ قبر واقع ہے۔ مسجد کے ساتھ مقبرے کا لزوم جو عموماً مسجد کے بانی کا ہوتا ہے، آگے چل کر عام ہونے والا تھا۔ مصر میں اس کی یہ اولین مثال ہے۔ صحن اور خادموں کے کمروں کے مشرق میں حرم واقع ہے۔ اس میں تین کمانوں کے ذریعہ داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ کمانیں جوڑی دار ستونوں پر اُٹھائی گئی ہیں۔ درمیانی کمان باقی دونوں کمانوں سے زیادہ چوڑی ہے۔ کمانیں نکیلی اور عام فاطمی طرز کی ہیں۔ ستون مرمر کے ہیں اور ان پر گھنٹے جیسے سرستون بنائے گئے ہیں۔ پھر اسی شکل کو اُلٹ کر کرسی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کرسی اور سرستون کی یہ شکل اسلامی فن تعمیر میں آگے چل کر عام ہو گئی۔ یہ شکل پتھر اور مرمر دونوں میں استعمال کی گئی اور یہ

بالکل واضح ہے کہ یہ اینٹ اور سنگستر کے مسالوں میں اس شکل کے سرستون کی تعبیر ہے جس کی مثالیں مصر میں ابن طولون کی مسجد میں، مسوپٹیمیا میں بمقام رقہ، پائیہ کے گوشوں میں لگے ہوئے دیوار میں بنے ہوئے دہروں کے اوپر پائی جاتی ہیں۔ یہ شکل بجائے خود کلاسیکی کارن تھئین سرستون کے نقل کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ محراب کے مقابل کے حصہ پر پندرہ فیٹ



شکل ۲۷ جامع الجیوشی کا نقشہ

محیط کا ایک گنبد ہے گنبد دیوار، محراب اور تین کمانوں پر بنایا گیا ہے۔ یہ کمانیں دیوار میں بنے

ہوئے نیم ستونوں اور گچ کے دو پایوں پر اُٹھائی گئی ہیں۔ مربع سے مثمن میں جو عبور بنایا گیا ہے اور اس پر گنبد بنایا گیا ہے، وہ اونچی کمان دار طاقوں کے ذریعہ بنایا گیا ہے اور یہ طاق گوشوں پر بنائے گئے ہیں۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو جامع الازہر اور جامع حاکم میں استعمال کیا گیا ہے۔ طاقوں کے اوپر مثمنی گنبد کو آگے پھیلایا گیا ہے تاکہ اس میں آٹھ دریچے بنائے جاسکیں۔ گنبد کو اونچا بنایا گیا ہے۔ اپنی نچلی منزل میں مینار مربع اور اوپر کی دو منزلوں میں مثمنی ہے۔ یہ بھی قدرے اونچے گنبد سے ڈھکا ہوا ہے۔ ان تین کمانوں کو جن پر حرم کا گنبد اُٹھایا گیا ہے حرم کی مغربی دیوار کی مشرقی سمت میں جانے والی کمانوں اور ان دیواروں میں سے بنے ہوئے نیم ستونوں کو شمالاً اور جنوباً بنی ہوئی دوسری کمانوں کے ذریعہ سہارا دیا گیا ہے۔ اس ترتیب سے جو پانچ قطعے بنتے ہیں ان کو متقاطع لداؤ چھتوں سے پاٹا گیا ہے۔ نقشے سے ظاہر ہے کہ تعمیر کار نے ایک ایسی چیز کو پسند کیا تھا جو اس زمانے میں یورپ کے نصرانی فن تعمیر میں پسند نہیں کی جاتی تھی۔ یعنی یہ کہ کمانوں کی بہ نسبت دیواروں پر مشتمل زیریں تعمیر کو پاٹنے کے لئے قوسی لداؤ چھت زیادہ موزوں ہے اور یہ کہ کمانوں پر مشتمل زیریں تعمیر کے لئے متقاطع لداؤ چھت

مناسب ہے ۔ عمارت گنڈ چنائی کی ہے اور اس پر استرکاری کی گئی ہے ۔ گنبد کا عبور، اور مینار اینٹ کے ہیں، مینار کے مربع عبور کے سرے پر اینٹ کی چنائی کے توڑے دار دو دور قلمی آرائش میں بنائے گئے ہیں ۔ مصر میں یہ شکل پہلی بار یہاں نمودار ہوئی ہے ۔ ان توڑے دار چنائی کے دوروں کا مقصد اس سطح پر اس چبوترے کو جس پر سے اذان دی جاتی تھی، اور عریض کرنا تھا ۔ اس چبوترے کو ایک جنگلے کے ذریعہ محفوظ کیا گیا ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ سنگ کاری کی صنعت جسے العزیز نے قاہرہ میں تین پشت پہلے رائج کیا تھا، جامع الجیوشی کی تعمیر کے وقت بالکل ناپید نہیں ہو گئی تھی ۔ لیکن اگر ان لوگوں کی ایسی اولاد باقی بھی رہ گئی ہو جو اپنے اجداد کی طرح اپنے فن میں ماہر تھی، تب بھی جامع الجیوشی کی تعمیر میں ان سے کام نہیں لیا گیا ۔ اس کی وجہ ممکن ہے کفایت شعاری ہو، یا ان کی خدمات فوجی کاموں کے لئے درکار ہوں ۔ بہت ممکن ہے بدرالجمالی کی آمد سے پہلے کے سخت اور پر آشوب زمانے میں سنگ سازی کی صنعت کو زوال ہو گیا ہو، اور العزیز کے عہد میں جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے تھے، اب ان کی اولاد صرف بھدی گنڈ چنائی کا کام کرنے لگی ہو، ایسی ہی بھدی گنڈ چنائی جس سے جامع الجیوشی کی مرکزی دیواریں

بنائی گئی ہیں۔
بہر حال کم سے کم یہ بات تو اچھی طرح واضح ہے کہ مسجد کی تعمیر اور اسی طرح اس کی تزئین میں مقامی صناعوں کی مہارت سے کام لیا گیا ہے۔ یہ مہارت ان لوگوں کی مہارت تھی جو مٹی اور استرکاری کی ایسی روایتوں پر عبور رکھتے تھے جو قاہرہ میں ایک عرصے سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی تھیں۔ جامع الجیوشی کا محراب ان کے کام کی ایک عمدہ مثال ہے (شکل ۲۶) استرکاری میں قرآنی کتبے اور شاخچۂ کمان میں بناتی بیل بوٹوں کے نمونے بناکر اس کی تزئین کی گئی ہے۔ محراب کے پہلوؤں میں دو ستون دئے گئے ہیں۔ باہر کی طرف کسی قسم کی تعمیری ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور نہ در اور دریچے نکالنے کا خیال آیا ہے۔

نقشے کی تبدیلی، مقبرہ کی موجودگی، لداؤ چھت کے مقابلہ میں سپاٹ چھت سے دست برداری، منقاطع لداؤ چھت کی ترویج، قلمی شکل کا ظہور، یہ تمام چیزیں نئے اثرات کا ثبوت ہیں جو اس زمانے میں مصر کا اسلامی فن تعمیر قبول کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مسجدوں کی تعمیر میں بیشتر ایسے ہی معمار (سوائے ان معماروں کے جنھوں نے منقاطع لداؤ چھت اور قلمی شکلیں بنائیں) لگائے گئے تھے جو عرصہ دراز سے قائم شدہ

مکتب کے پیرو تھے، تاہم نقشہ سازی اور عمومی ہدایت کا کام غالباً کسی ایسے ملک کے باشندے کے ہاتھ میں تھا جہاں منقاطع لداؤ چھت کا عام رواج ہوگا۔ ممکن ہے ایسا شخص پناہ گزیں کی حیثیت سے شام سے یا اور بھی شمال سے غالباً کسی ایسے فاطمی یا ممکن ہے بازنطینی صوبے سے آیا ہو جس پر سلجوق حملہ آوروں نے قبضہ کرلیا تھا۔

لیکن یہ اس عہد کی فوجی تعمیر کاری ہے جو مصر میں فنّی اثرات کی ایک نئی رو کی موجودگی کا زبردست ثبوت پیش کرتی ہے۔ بدرالجمالی نے قاہرہ کی شہر پناہ از سر نو تعمیر کی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے شہر کو پھیلا کر جامع الحاکم کو شمالی شہر پناہ کے اندر لے لیا تاکہ شہر کی مدافعت کی اسکیم میں مسجد کے ابھرے ہوئے میناروں سے کام لیا جائے۔ اس شمالی شہر پناہ میں دو دروازے باب النصر اور باب الفتوح بنائے گئے تھے۔ یہ دروازے جامع الجیوشی کے دو سال بعد سنہ ۱۰۸۷ء میں تعمیر کئے گئے۔ العزیز کی بنائی ہوئی شہر پناہ کچّی اینٹوں سے غالباً کسی قدر چونا ملے ہوئے گارے مٹی کی کنڈ چنائی کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی۔ بدرالجمالی کی بنائی ہوئی شہر پناہ پتھر کی ہے۔ جنوبی شہر پناہ کو بھی بدرالجمالی نے نئے سرے سے تعمیر کیا اور اس میں ایک بڑا دروازہ بنایا جو باب الزاولہ کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ شمالی دروازوں کی تعمیر کے دو



شکل ۱۴۷ جامع الجیوشی کا محراب

سال بعد سنہ ۱۰۹۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ شمالی قلعہ بندی کو اولیت دی گئی تھی۔ بدر الجمالی کی فوجی تعمیر کاری میں داسون یا نہایت عمدہ ترشے ہوئے پتھر میں بنی ہوئی

نیم قوسی کمانوں کے ذریعہ موکھوں میں فصل دیا گیا ہے۔
یہاں ایرانی کمانیں، اینٹ اور سنگستر سرے سے ناپید ہے۔
اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہم یہ محسوس کرتے ہیں گویا
یہ کوئی یورپی عمارت ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے
جو بحر روم کی تہذیب سے مشابہ اور روما اور اس کی
سلطنت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ دروازوں کو برجوں
کے ذریعہ سہارا دیا گیا اور انھیں محفوظ کیا گیا ہے۔
داسے دندانہ دار پتھریں بنائے گئے ہیں اور ان کے اوپر
خسی ڈاٹیں بنائی گئی ہیں۔ اسلامی فن تعمیر میں دندانہ دار
پچر کے استعمال کی اولین مثالیں اسی عہد کی باقیات میں
ملتی ہیں۔ بے شبہ متقاطع لداؤ چھت اور قلمی شکل کی
طرح اس کو بھی کسی شمال کے شامی یا بالائی مسوپٹیمیا
یا ایشیائے کوچک کے مہاجر یا پناہ گزیں نے مصر میں
رواج دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قبل اسلام
شام میں اس کا رواج تھا[۵] اور کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی
فتح کے بعد ایسی کار آمد چیز متروک ہو گئی ہو۔ ایک
اور دلچسپ چیز دیواری روزن ہیں۔ یہ دیواری روزن
باب النصر (شکل ۲۸) کی مدافعت کا ایک جزو ہیں۔
جہاں تک مجھے علم ہے۔ روزن مدافعتی تدبیر کی اولین
مثال ہیں، اور انھیں تقریباً ایک صدی کے بعد یورپ

---

۵ حال ہی میں اس کا ایک نمونہ فلسطین میں دریافت ہوا ہے۔

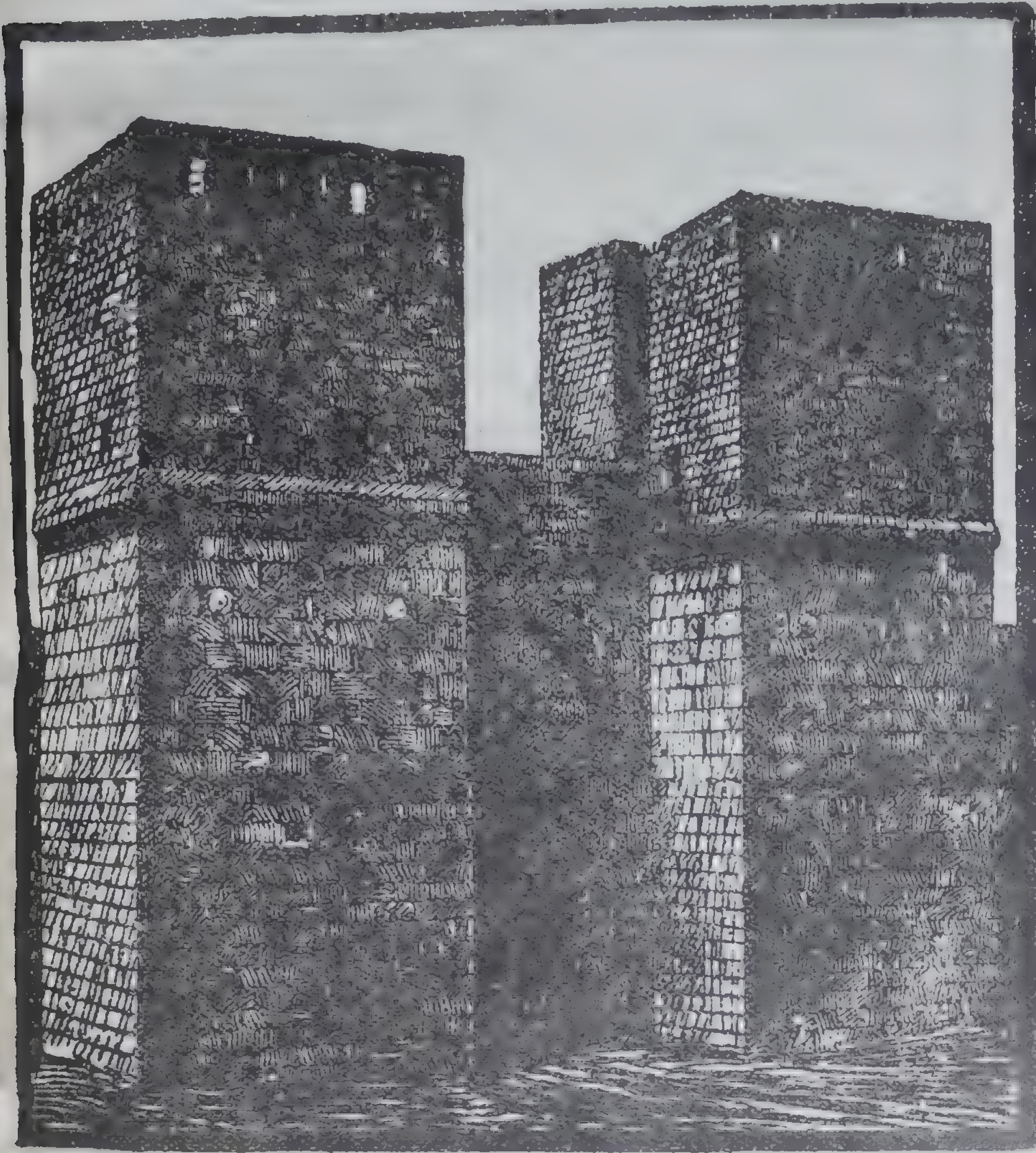
میں اختیار کیا گیا ہے ۔ یہ عظیم الشان دروازے مدرسے کے تعمیر کاروں نے بنائے ہیں[1] یہ تعمیر کار قلعہ بندی کے بازنطینی اصولوں سے نہایت اچھی طرح واقف تھے مدرسہ عرصہ دراز تک ایشیا کے مقابلہ میں بحر روم کی تہذیب کا ایک بڑا ضامن رہا ہے ۔

اگر جامع الجیوشی اس عہد کے مصر میں شمالی ملکوں کے صناعوں، تعمیر کاروں اور سنگی تعمیر کی روایتوں کی آمد کی شہادت دیتی ہے تو قاہرہ کے عظیم الشان دروازے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں ۔ اس زمانے میں مصر سلجوق حملوں سے متاثر فاطمی یا بازنطینی یا ان دونوں کے درمیانی علاقوں کے صناعوں اور دوسرے لوگوں کے لئے ایک محفوظ اور ممکن ہے نفع بخش ملک سمجھا گیا ہو ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض صناع اور تعمیر کار جو نصرانی تھے یورپ میں پناہ گزیں ہوئے اور اس زمانے میں لداؤ چھت کے فن میں جو اہم تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئیں ان میں حصہ لیا ہو ؟ سلاجقہ کی فتح آرمینیا گرجستان ، اور تمام ایشیائے کوچک ان ملکوں کے نصرانی باشندوں کے لئے ایک ایسی مصیبت تھی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے[2] جو لوگ اپنا ملک چھوڑ کر

---

[1] مقریزی ، ج ۱ ، ص ۳۸۱ ، سطر ۵ ۔ [2] "دارالسلطنت روما کا انحطاط و زوال" از گبن ۔ GIBBON, "DECLINE & FALL OF ROMAN EMPIRE."

دوسرے ملکوں کا رُخ کر سکتے تھے انھوں نے بے شبہہ نصرانی ملکوں کا ہی رُخ کیا ہو گا۔ اس طرح بہت سے اعلیٰ درجے کی مہارت رکھنے والے تعمیر کاروں اور صناعوں نے ملک سے باہر قسمت آزمائی کی ہوگی، یا ان ملکوں میں اپنا روزگار تلاش کیا ہو گا۔ مشرق میں منتقل ہونے سے انھیں کوئی فائدہ نہ تھا، کیونکہ وہاں بھی ترک سلاجقہ



شکل ۲۸ باب النصر قاہرہ

موجود تھے۔ صرف مغرب کا راستہ ہی ان کے لئے کھلا تھا۔ گیارھویں صدی کے بربری یورپ نے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا ہوگا، اور کم سے کم مشرق سے آنے والے متمدن اور اعلیٰ مہارت رکھنے والے صناعوں سے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے ترک سلاجقہ کی وجہ سے جنوب کی طرف فرار ہونے والے گروہ کے مسلمان، لیکن غالباً بے دین عناصر سے مصر کا استفادہ کرنا واضح و معلوم ہے۔

خلیفہ المستنصر کے بعد اس کا سب سے چھوٹا بیٹا المستعلی اس کا جانشین ہوا۔ اس کا وزیر اعظم، بدرالجمالی کا بیٹا، الفضل شہنشاہ تھا۔ مستنصر کے سب سے بڑے بیٹے نے اپنے نظر انداز کئے جانے پر خفا ہو کر امام مصطفیٰ کا لقب اختیار کر کے اسکندریہ میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لیکن اسے زیر کر لیا گیا اور وہ قید خانہ سے غائب ہو گیا۔[۵] ایک زمانہ تک وہ شام کے اسماعیلیوں یا حشاشینیوں کے نزدیک شیعوں کا سچا امام اور سردار سمجھا جاتا رہا۔ المستعلی نو عمری ہی میں فوت ہو گیا اور اس کا پانچ سالہ بیٹا العامر اس کا جانشین ہوا۔ وزیر الفضل مقتدر کل ہو گیا تھا، اور بیس سال تک اس نے مصر پر اسی طرح حکومت کی جیسی کہ اس سے پہلے اس کے باپ بدرالجمالی نے کی تھی۔ یہ صرف ان دو

---

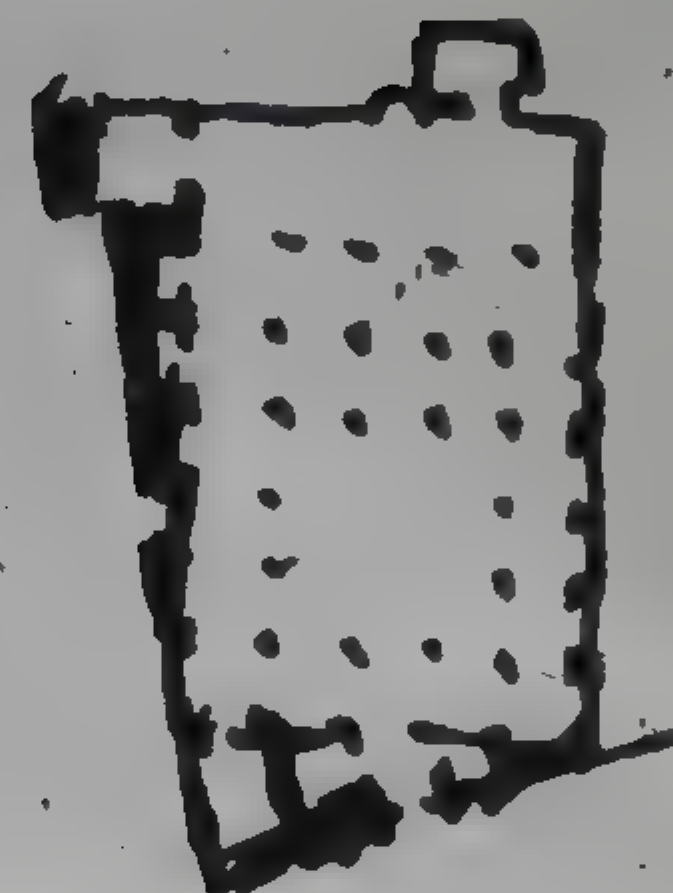
۵ اسٹینلی لین پول، Gibbon, "Decline & Fall of Roman Empire".

زبردست ارمنی امیروں کی برکت تھی کہ ان کی وجہ سے مصر کو سنہ ۱۰۷۴ء سے لے کر سنہ ۱۱۲۱ء تک نصف صدی کا امن و امان اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

الفضل کو اپنے باپ کی طرح سلجوق حملے کا اتنا ڈر نہ تھا۔ کیونکہ سنہ ۱۰۹۲ء میں ملک شاہ کی وفات کے بعد سلجوق سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ لیکن ایک نیا خطرہ مصر کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ سنہ ۱۰۹۶ء میں پہلے صلیبی حملے نے مشرق کا رُخ کیا۔ سنہ ۱۰۹۸ء میں صلیبی حملہ آوروں نے عدسہ اور انطاکیہ فتح کر لیا۔ اور اس کے دوسرے سال بیت المقدس بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد کے چند سالوں میں فلسطین کے ایک بڑے حصہ اور شام کے ساحل پر ان کا تصرف ہو گیا۔ بارھویں صدی کے ربع اول کے اختتام کے قریب ان کی قوت اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئی۔ نصرانی حملے کی خبریں سن کر پہلے الفضل خوش ہوا، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشترکہ دشمن سلاجقہ کے مقابلہ میں نصرانیوں سے اتحاد کرنا چاہتا تھا۔ بیت المقدس کی فتح سے ایک سال پہلے الفضل نے یہ شہر سلاجقہ سے چھین لیا تھا۔ اس طرح نصرانیوں نے اس شہر کو سلاجقہ سے نہیں بلکہ فاطمیوں سے، سنّیوں سے نہیں بلکہ شیعیوں سے حاصل کیا تھا۔ فاطمی سلطنت پر نصرانیوں کے اس حملے

کے بعد دوسرے سال عسقلان پر ان کے دوسرے حملہ نے اتحاد کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اور الفضل سنہ ۱۱۲۱ء میں اپنی وفات تک صلیبی حملہ آوروں سے مسلسل جنگ کرتا رہا۔ الفضل کا جانشین البطیحی ہوا۔ اس نے سنہ ۱۱۲۵ء میں جامع الاقمار بنائی۔ یہ مسجد دو سڑکوں کے گوشوں پر بنائی گئی ہے اور تقریباً ۶۰ ضرب ۱۲۰ فیٹ کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اصل باب الداخلہ دیوار قبلہ کے مقابل آخری سرے پر واقع ہے۔ (شکل ۲۹) اس کے دائیں بائیں کمرے بنے ہوئے ہیں اور ایک زینہ مینار تک جاتا ہے۔ یہ مینار جامع الجیوشی کی طرح باب الداخلہ کے اوپر قائم کیا گیا تھا۔ ڈیوڑھی سے گذرنے کے بعد ایک کھلا صحن ملتا ہے۔ یہ صحن تین طرف سے ایوانوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایوان حرم تک چلے گئے ہیں۔ حرم کو دو چھتوں کے ذریعہ تین بغلی دالانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ بغلی دالان دیوار قبلہ کے متوازی بنائے گئے ہیں۔ ہر چھتہ پانچ کمانوں پر مشتمل ہے جو کورنتھین سر ستون والے چار ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ درمیانی کھانچے کو ایک گنبد کے ذریعہ پاٹا گیا تھا۔ یہ گنبد اب گر چکا ہے۔ اس مسجد کی دلچسپ ترین چیز اس کا پیش رُخ ہے، اور یہ دیواروں کے بیرونی رُخ پر تعمیری حسن کاری کے مظاہرے کی اولین

کوشش ہے۔ باب الداخلہ ایک طاق کے اندر بنایا گیا ہے، اور اس کے اوپر ایک نکیلی کمان بنی ہوئی ہے۔ اس کمان کو ایک ایسے نقشے سے مزّین کیا گیا ہے جو محراب کے کلاسیکی صدف نما سروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دروازے کے اوپر کی سردل دندانہ دار پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اور یہ طریقہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مصر میں پہلی بار چالیس سال پہلے باب النصر میں استعمال کیا گیا تھا۔ کوفی خط میں ایک کتبہ سے پیش رُخ کے اوپری حصّہ کی تزئین کی گئی ہے۔ مسجد گنڈ چنائی کی ہے اور باہر کی طرف اس کی سطح پر گھڑے ہوئے پتھر لگائے گئے ہیں۔ اندر کی طرف جہاں چھتوں کی کمانوں کے اطراف استرکاری میں کتبے بنائے گئے ہیں وہاں استرکاری کی گئی ہے۔ داخلے کے دائیں اور بائیں چھوٹے چھوٹے طاق ہیں۔ ان طاقوں کے سروں پر قلمی آرائش کا کام کیا گیا ہے۔ یہی شکلیں عمارت کے گوشوں میں جہاں یا تامی زاویہ مربع کی طرف ٹپتا ہے۔ توڑے کے پتھروں کی تزئین کے لئے بنائی گئی ہیں۔ "قلمی شکل" کی اصطلاح عموماً ایسے طریقۂ تزئین کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جس سے پتھر میں زانخ بندی کے چنائی دردں میں کام لیا جاتا ہے، اور ہمیشہ تو نہیں لیکن اکثر ان شکلوں سے ایک نقشہ سے دوسرے نقشہ کے عبور کو موثر بنانے میں کام لیا جاتا ہے۔





شکل ع۲۹ جامع الاقمار

مثلاً ایک مربع زیریں تعمیر کو دائرہ میں تبدیل کرنا، جیسا کہ گنبدوں کی تعمیر میں کیا جاتا ہے۔ یا کسی دیوار میں بنے ہوئے طاق کو دیوار کی ہموار سطح میں لانا۔ قلمی شکل کی تزئین میں نکیلی کمان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عبوروں کے بنانے میں چار تعمیری عناصر سے کام لیا جاتا ہے — شہتیر، کمان، توڑا اور گنبدی کے کروی حصے۔ آخر الذکر عنصر ابتدائی مسلم تعمیر کاریوں میں نہیں ملتا۔ لیکن کمانیں، توڑے اور شہتیر عام طور پر ملتے ہیں

کمانیں اور توڑے پتھر اور اینٹ دونوں میں بنائی گئی ہیں اور انھیں تعمیری طور پر سنگی تعمیریں تو نہیں البتہ اکثر خشتی تعمیریں ایک دوسرے سے ملا دیا گیا ہے۔ پتھر میں ترشی ہوئی قلمی شکل میں کمان کا خالص تزئینی استعمال بے شبہ مربع سے دائرہ میں استعمال ہونے والی تعمیری کمان نے سجھایا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلمی شکلوں نے بعض سنگی تعمیر کے ملکوں میں اور اغلباً شمالی مسوپٹیمیا میں ترقی پائی۔ وہ کڑیاں جو قلمی شکلوں کی ترقی کا پتہ دیتیں اب ناپید ہوگئی ہیں۔ پتھر میں توڑوں کی مثالیں شام میں پائی جاتی ہیں۔ اور توڑے دار خشتی تعمیر کی ایک دلچسپ مثال جو نہایت سادہ وضع کی ہے قبل اسلام کے ایک چھوٹے سے کلیسا، کلیسائے مار آگن (MAR AUGAN) میں پائی جاتی ہے۔ یہ کلیسا شمالی مسوپٹیمیا میں بمقام طور عابدین واقع ہے۔

جامع الاقمار کی تعمیر کے سات سال بعد سنہ ۱۱۳۲ء میں ایک مقبرہ جو "مقبرہ سیدہ رقیہ" کہلاتا ہے قاہرہ میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ایک گنبد والی عمارت ہے اور خشتی تعمیر میں زاغ بندی کی چنائی اور کمان دار محرابوں کو ملا کر مربع سے دائرہ میں عبور بنانے کے طریقہ کی وضاحت کے لئے ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ اکہری کمان دار محراب ہی کی ایک پر تکلف شکل ہے جو اس غرض کے

لئے جامع ازہر، جامع الحاکم اور جامع الجیوشی میں استعمال کی گئی ہے۔ ان عمارتوں میں زیریں تعمیر کے مربع کا مثمن میں عبور ایک درجہ میں بنایا گیا تھا، اور اس پر گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ مقبرہ سیدہ رقیہ میں یہ عبور دو درجوں میں بنایا گیا ہے۔ اوپر کا درجہ ایک کمان دار محراب پر مشتمل ہے اور محراب مثمن کے دو کار کے نصف کے برابر عریض ہے (شکل ۳۱) اس محراب کا نقشہ مستطیلی ہے اور یہ مربع کے گوشوں پر واقع ہے۔ اس کے بیرونی زاویے چھوٹی چھوٹی لداؤ چھت کی ایسی محرابوں پر اُٹھائے گئے ہیں جن میں ہر ایک کے نیچے کی سطح ایک قائمۃ الزاویہ مثلث بناتی ہے اور اس مثلث کی تنصیف سلامی چھت کی نکری کا خط کرتا ہے۔ یہ چھوٹی قوسی لداؤ چھتیں ویسے ہی مثلثی دیواری پایوں پر اٹھائی گئی ہیں جن پر نچلی محراب کے اوپر کی کمان اُٹھائی گئی ہے۔ لداؤ قوسی چھتوں والی محرابوں اور نچلی وسطی محراب کے درمیانی قطعات گنبد کے مثلث نما کروی حصّوں سے پُر کئے گئے ہیں۔ ان چار محرابوں کے مجموعہ کا خاکہ اس مجموعہ کا جواب ہے جو دو کمان دار دریچوں کے اوپر ایک اور کمان دار دریچے پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ تین روش دانی دریچوں کا ایک مجموعہ بناتا ہے جو مثمن کے ہر متبادل ضلع پر بنایا گیا ہے۔ یہ



شکل ۳۰ مقبرہ سیدہ رقیہ کے گنبد کا عبور

کمان دار محرابیں جو اینٹ میں بنائی گئی ہیں اسی شکل کی ہیں جو توڑے کے پتھروں کے سروں پر قلمی آرائش میں پائی جاتی ہیں۔ قلمی شکلوں کی اصل غالباً تزئینی مقاصد کے لئے ان شکلوں کی نقل ہے جو کمان دار محرابوں سے لے کر توڑے تک استعمال میں آتی ہیں، اور جس کی ایک مثال سیدہ رقیہ کا مقبرہ ہے۔ یہ شکل سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کسی ایسی شکل کو تزئینی طور پر استعمال کیا گیا ہو جس کی نظیر تعمیر میں ملے۔ اور چونکہ ہمیں "قلمی شکلیں" سیدہ رقیہ کے مقبرے سے بھی پہلے کے عہد میں ملتی ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عبور بنانے کے لئے مرکب محراب کے طریقے کی مثالیں سیدہ رقیہ کے مقبرہ سے بھی پہلے موجود تھیں (اگرچہ غالباً یہ مصر میں نہ ہوں گی)۔ مصر میں اس طریقہ کا رواج ایسے لوگوں پر سلجوق — یعنی سُنّی — دباؤ کا ایک نتیجہ ہے جو دوسرے اسلامی ممالک جیسے شام، عراق، میسوپوٹیمیا اور ایران میں شیعی عقائد کے پیرو تھے، اور فرار ہو کر فاطمی مصر کی سازگار فضا میں آ گئے تھے۔

سنہ ۱۱۵۲ء میں فلسطین میں فاطمیوں کا آخری قلعہ عسقلان صلیبی محاربوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے سات سال بعد جامع صالح طلائی ابن ازّرق جو عملاً فاطمیوں کا آخری تعمیری کارنامہ ہے قاہرہ کے جنوبی دروازے کے باہر اور اس کے قریب ہی تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد ایک مستطیل قطعہ زمین پر بنائی گئی ہے۔ اور اس کی مساحت تقریباً ۱۲۵ ضرب ۸۵ فیٹ ہے۔ احاطے کی دیوار میں داخلے بنائے گئے ہیں۔ بڑا باب الداخلہ تو اپنی اصلی جگہ یعنی دیوار قبلہ کے مقابل سرے پر واقع ہے، باقی دو در بازو کی دیواروں میں بنائے گئے ہیں۔ جامع الجیوشی اور جامع الاقمار جیسی دوسری چھوٹی فاطمی مسجدوں کی طرح اس مسجد میں بھی مینار بڑے باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا ہے، اور اس کے دائیں بائیں طلبہ کے لئے کمرے ہیں۔ اس سرے پر کوئی ایوان نہیں ہے۔ صرف بازو کی دیواروں پر ایوان ہیں۔ حرم کا عمق مسجد کے طول کا ایک تہائی ہے اور اس کا چھت تین چھتّوں پر اُٹھایا گیا ہے جو دیوار قبلہ کے متوازی جاتے ہیں ستون، سرستون اور کرسیاں قبل اسلام کی ہیں۔ ان میں سے بعض نصرانی کلیساؤں سے لئے گئے ہیں کیونکہ ——— ان پر صلیب کندہ کی ہوئی ملتی ہے۔ سرستون کے اوپر چوبی DOSSER[73] ہیں۔ ان سے چوبی بندھن ملائے گئے ہیں۔ کمانیں اونچے ستون دے کر عام فاطمی طرز میں بنائی گئی ہیں، اور انھیں پکی

اینٹوں اور گچ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ چھت سپاٹ ہے اور یہ ابتدائی طریقے کی طرف باز گشت ہے۔ بیرونی دیوار پتھر کی ہے۔ یہ پتھر باہر کی طرف گھڑا ہوا ہے اور اندر کی طرف اس پر استرکاری کی گئی ہے۔ کوفی کتبے جو استرکاری میں بنائے گئے ہیں حرم کی کمانوں کے گرداگرد چلے گئے ہیں۔ ایک چوبی مقصورہ صحن سے حرم کو جدا کرتا ہے۔ دریچے دہرے تھے۔ اندرونی دریچے استرکاری میں منبت کار ہیں اور ان میں عمارت کے اندرون کی زیبائش کے لئے رنگین شیشے لگائے گئے ہیں۔ بیرونی دریچے استرکاری کی جالیوں کے ہیں۔ یہ جالیاں بیرون عمارت کی زیبائش کے لئے بنائی گئی ہیں۔ دہرے دریچوں کا یہ وہی طریقہ ہے جو قبۃ الصخرہ میں موجود ہے، اور اس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں۔ محراب میں شیشے کی پچی کاری کی گئی ہے اور اس کے دونوں بازوؤں پر ہشت پہل ستون لگائے گئے ہیں ان ستونوں کے سر ستون اور کرسیاں گھنٹے کی وضع کی ہیں اس کا ممبر باریک ہندسی دلاکاری کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے (شکل ۲۵) یہ ممبر حیرت انگیز طور پر مختلف النوع گلکاری کے نباتی نمونوں سے رسا ہوا ہے۔ استرکاری کی تزئین اور ممبر دونوں پر سے رنگ کے سارے نشانات محو ہوچکے ہیں عمارت کا بیرونی رخ گھڑے ہوئے پتھر کا ہے، اور اس کے بالائی حصے کی تزئین کوفی کتبوں کی

پٹیوں سے کی گئی ہے۔

فاطمی عہد کے آخر تک مسجد کی ضروریات بہت بڑی حد تک اتنی ہی رہیں جتنی کہ چار صدی پہلے تھیں یعنی تنہائی کے لئے محصورہ احاطہ، اس احاطہ کے سرے پر ایک مسقف حرم، حرم تک پہنچنے کے لئے دونوں بازوؤں پر دالان بناکر سایہ دار راستے، اور درمیان میں وضو کے لئے کھلا صحن۔ فاطمیوں کے زمانے تک بھی مسجد کے اہم خط و خال یہی رہے۔ لیکن اب مقبرہ کو بھی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اور فاطمی عہد کے دوران میں یہ چیز پہلی بار مسجد کے نقشہ میں جگہ پاتی ہے۔ چنانچہ جامع الجیوشی کا یہی حال ہے۔ ضروریات کی تکمیل اور نئی نئی شکلیں اختیار کرنے میں طریقہ کار بھی بدلتا گیا۔ الحاکم کے عہد کے بعد جو چھوٹی مسجدیں تعمیر ہوئیں ان میں ایک ہی مینار کافی سمجھا گیا۔ یہ مینار باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا۔ یہی جگہ اس مینار کے لئے موزوں ترین جگہ ہے جس پر سے مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہوکر نماز ادا کرنے کی صلاح دی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد سے باب الداخلہ اور مینار میں ——— چند استثناؤں کو چھوڑ کر ——— بہت ہی قریبی تعلق رہا ہے۔ نئی تعمیری شکلوں میں چھت کے لئے لداؤ چھت اور گنبد ایک شکل سے دوسری شکل میں عبور کے قلمی شکلوں سے مزین توڑے اور نہایت پرکار محرابیں بنانے کا طریقہ

اُٹھا ہوا گنبد، دندانے دار سردل، گچ کی جالیوں میں بٹھائے ہوئے رنگین شیشے کے دریچے، منبت کار استرکاری، یا لکڑی کی جالیاں ـــ ویسے ہی موکھوں میں بٹھائی ہوئیں جیسے کہ رنگین دریچے، دیوار کے بیرونی کنارے پر ـــ ہندسی زمین کو نباتی نمونوں کے ساتھ ملاکر تزئین کے طریقوں میں غیر معمولی پرکاری، مربع سے مثمن اور مثمن سے دائرے میں تبدیل ہونے والے درجہ بدرجہ منزلوں والے مینار ـــــــ یہ تمام عناصر جو اسلامی فن تعمیر کی اہم ترین خصوصیات ہیں، فاطمی دور میں ظہور پذیر ہوئیں اور آخر میں اتھل طاقوں اور ان کے درمیان سنگی پایوں کے ذریعہ پیش رُخ کی تزئین ایسی ترقی تھی جو مصر میں ہمسایہ ملکوں سے سنگ کاروں کے داخلے کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔

بنی فاطمہ کے آخری دور حکومت میں عملی طور پر خلیفہ بے دست و پا ہوکر رہ گیا تھا۔ شاہی وزراء یا تو دمشق کے سلجوق حاکم نورالدین یا فلسطین کی نصرانی حکومت کی امداد حاصل کرتے اور انھیں مداخلت کی دعوت دیتے تھے۔ سلجوقوں اور نصرانیوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ مصر پر حملہ کیا۔ لیکن یہ سلجوق ہی تھے جن کے نصیب میں اپنے قدموں کو مصر میں مضبوطی سے جمانا اور شیعی فاطمیوں کا خاتمہ کرنا لکھا تھا۔ سنہ ۱۱۶۸ء میں شیرکوہ نے نورالدین

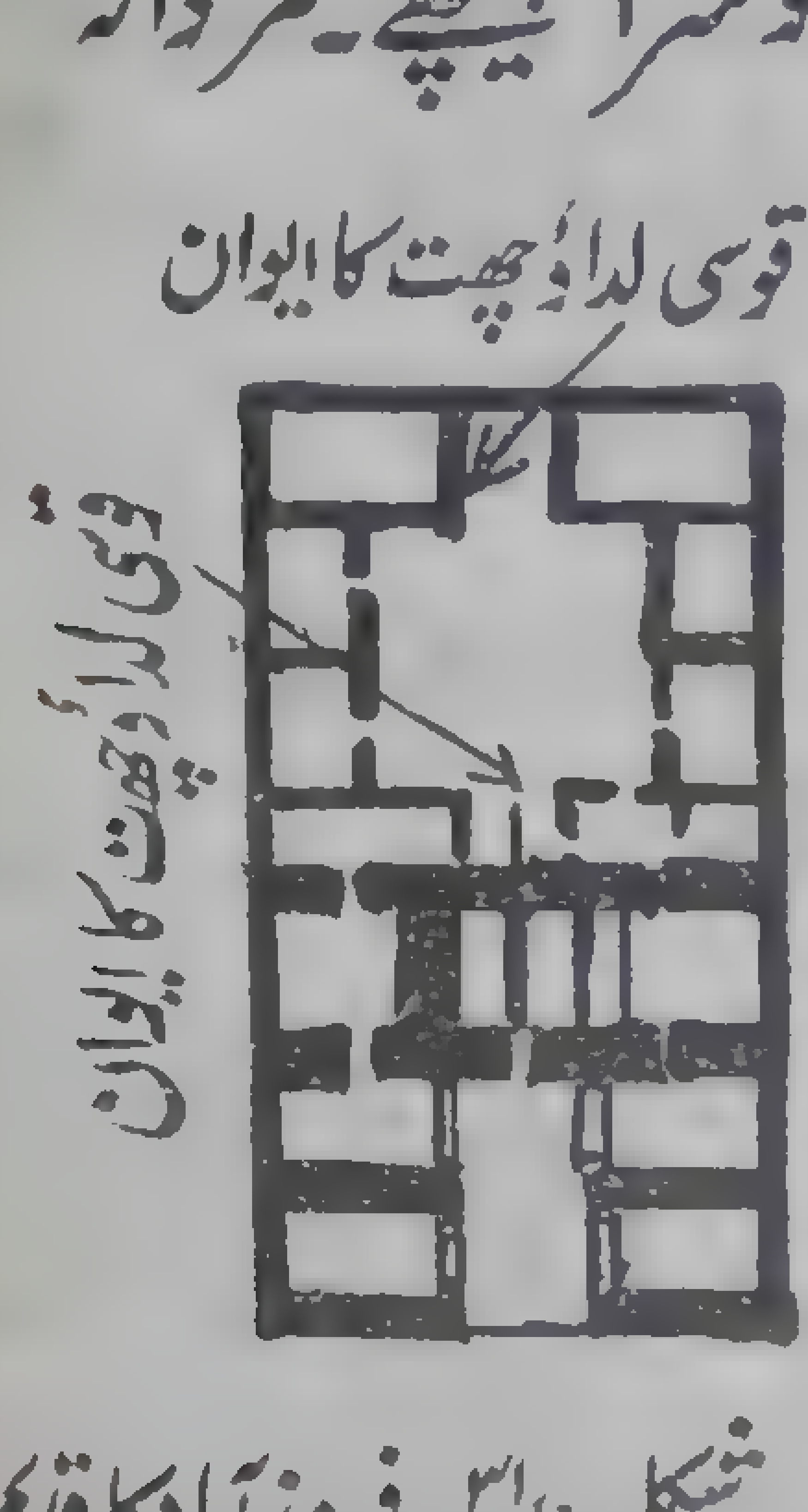
کو ایک فوج کے ساتھ دمشق سے روانہ کیا، اور اس نے
اپنے نامور بھتیجے صلاح الدین کے ساتھ مصر پر نہایت کامیابی
کے ساتھ حملہ کیا اور فاطمی خلیفہ عاضد کا وزیر اعظم بن بیٹھا۔
اس کے دوسرے سال صلاح الدین اپنے چچا کا جانشین ہوا،
اور دو سال بعد آخری فاطمی خلیفہ عاضد نے انتقال کیا۔
اور کوئی دوسو سال کے وقفے کے بعد مصر میں سُنّی مذہب سرکاری
طور پر قائم ہوگیا۔ اگرچہ اب شیعی عقائد کا سب سے بڑا
حامی فاطمی خلیفہ باقی نہیں رہا تھا، تاہم لوگوں کی اکثریت
شیعی مذہب اور شیعی عقائد کی پیرو تھی اور نئی سیاسی
تنظیم کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ بحر روم کے
مشرقی ساحلوں پر سُنّی مذہب کو کامیابی کے ساتھ اپنے
قدم جمانے کے لئے صرف اسی مشکل کا سامنا کرنا نہ تھا۔
فلسطین اور شام میں نصرانی قوت کی طرح مصر اور شام
میں شیعی عقائد کا استیصال ضروری تھا۔ فاطمی بغاوت
کے خطروں کا مقابلہ کرنے کے لئے صلاح الدین نے
قاہرہ کا قلعہ فصیل دار محصورے کی صورت میں بنایا تاکہ
یہ ممکنہ سرکشیوں کے مقابلہ میں ایک پناہ گاہ یا حملہ کے
لئے صدر مقام بن سکے۔ لیکن خالص فوجی تدبیریں دائمی
حفاظت کی ضامن نہیں ہوسکتیں۔ خطرے کی اصل جڑ یہ
عقائد تھے۔ اس جڑ کو اکھیڑ دینا ضروری تھا۔ یہ کام
صرف تعلیم ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے مصر

میں سُنّی مذہب کی تعلیم کے لئے درس گاہوں کا قیام فوری توجہ کا محتاج بن گیا۔ دوسرے ملکوں میں اس مقصد کے لئے پہلے سے درس گاہیں موجود تھیں۔ مثلاً خراسان کے شہر نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ صلاح الدین سے ڈیڑھ صدی پہلے موجود تھا۔ اور سلجوق اعظم سلطان ملک شاہ نے سلجوقی سلطنت کے بڑے بڑے ایشیائی شہروں میں شیعی بدعت کا تعلیم کے ذریعہ کامیابی اور قابلیت کے ساتھ مقابلہ کرنے میں اتنی بیدار مغزی سے کام لیا تھا، کہ اس نے مدرسہ کو ایک سرکاری ادارہ بنا دیا۔ مصر میں اس طریقہ کی توسیع سے صلاح الدین نے وہی کام کیا جو اس کا پیش رو نور الدین اور وہ خود مسوپٹیمیا اور شام میں کر چکا تھا۔ سُنّی مذہب کی تعلیم کے نصاب میں اسلامی فقہ اور حدیث کا وہ نقطۂ نظر شامل ہے جس کی روشنی میں ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے تمام معاملات طے کرنا چاہیئے۔ اس طرح فقہ یا دوسرے معنیٰ میں تعبیر حدیث کے چار سُنّی مکتب خیال ہیں۔ یہ مکتب اپنے بانیوں کے نام سے مالکیہ، حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ مشہور ہیں۔ ان کے اختلافات بہت سطحی ہیں۔ لیکن ان کے احکام خود اس کے علماء پڑھاتے تھے۔ یہ سب کے سب ایک ہی عمارت میں جمع کئے جا سکتے تھے، لیکن ہر ایک کے لئے ایک جداگانہ ہال یا کمرۂ درس مہیّا کرنا ضروری تھا۔ "مدرسہ" کا لفظ اسی قسم کی درس گاہ

کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لغوی طور پر اس لفظ کے معنی "مقام درس" کے ہیں۔ مدرسوں کی ضرورت نے ——— اور یہ ضرورت سُنّی اور شیعہ اختلاف کی بنا پر پیدا ہوئی ——— اسلامی مذہبی تعمیر کاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اگرچہ مسجد اصلاً نماز پڑھنے کی جگہ ہے، تاہم تدریسی اغراض کے لئے بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ العزیز کے زمانے میں جامع ازہر اس مقصد کے لئے استعمال کی جا رہی تھی۔ لیکن اس مقصد کے لئے مسجد کو استعمال کرنے سے اس کے نقشہ میں صرف جزئی تبدیلی ہوئی اور ایک بالکل نئی وضع کا نقشہ پیدا نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود فاطمیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ مسجد کا نقشہ ترمیم شدہ ہونے کے باوجود ان کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک الگ اور خاص طور پر بنائی ہوئی عمارت "دارالحکمت" کے نام سے مختص کی گئی۔ مدرسہ گویا شیعی دارالحکمت کا سُنّی جواب تھا۔ شام اور مصر میں بعض ابتدائی مدرسے خانگی مکانوں میں قائم کئے گئے تھے[۵] اور بعض کے لئے مخصوص عمارتیں مہیّا کی گئی تھیں لیکن تعلیم خواہ خانگی مکانوں میں دی جاتی خواہ خاص طور پر تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں، تدریسی مقاصد کے لئے مختص

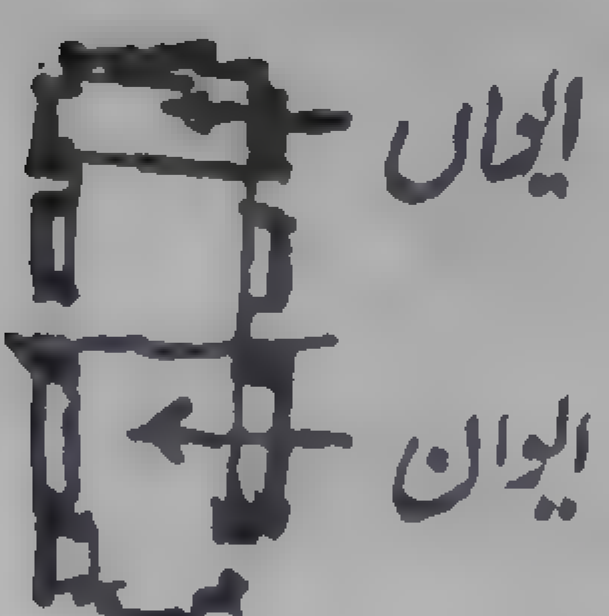
سے ۵ THE ORIGIN OF THE CRUCIFORM PLAN OF CAIRENE MADRASA, BY K.A.C. CRESSWELL. P.P. 45, 47.

کیا ہوا اصل کمرہ یا کمرے ایک ہی نقشہ پر ہوتے تھے۔ یہ کمرے مستطیل قطعہ زمین پر مشتمل ہوتے تھے۔ مستطیل کے تینوں ضلعوں پر دیواریں ہوتیں اور چوتھا ضلع کھلا اور صحن کی طرف ہوتا تھا۔ ایسے اوّلین تدریسی کمرے جو اب تک باقی رہ گئے ہیں۔ شام میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر لداؤ قوسی چھتیں ڈالی گئی ہیں۔ لداؤ قوسی چھتوں والے کشادہ کمرے اسلام کے استقلال سے پہلے بھی ایشیا میں پائے جاتے تھے۔ فیروز آباد میں ایک ساسانی محل کی باقیات ایک ایسے نقشے پر قائم ہیں جس کی دو اہم خصوصیات عہد ملوک تک شام اور مصر کے اسلامی گھروں کے نقشے میں پائی جاتی ہیں۔ فیروز آباد کا محل (شکل نمبر ۳۱) اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اس کا ایک حصّہ مردانے کے لئے اور دوسرا حصّہ خانگی اور منزلی زندگی کے لئے استعمال ہو سکے۔ پہلا حصّہ گھر کے سامنے ہے اور دوسرا پیچھے۔ مردانہ حصّہ میں قوسی لداؤ چھت کے کشادہ کمرے ہیں۔ یہ کمرے ایک قوسی لداؤ چھت کے صحن میں کھلتے ہیں صحن میں سیدھے باہر سے داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ حصّہ اسلامی گھر میں "مقعد" یا مقام استقبال (لغوی معنی "بیٹھک") کے مماثل



شکل نمبر ۳۱ فیروز آباد کا قدیم محل

ہے۔ مقعد ایک کشادہ کمرے اور صحن کی جانب ایک چھتّے دار پیش پر مشتمل ہوتا تھا، اور عموماً صحن کے شمال میں بنایا جاتا تھا۔ فیروز آباد کے محل کے اندرونی حصّے میں عین وسط میں ایک کھلا صحن ہے۔ اس پر نداؤ چھت کا ایک ہال ہے اور لداؤ چھت کی کمانیں صحن کے رُخ پر ہیں۔ یہ اسلامی گھر کے "قاعۃ" یا اندرونی ہال کے مماثل ہے۔ قاعۃ (شکل ۳۲) میں بھی ایک مرکزی حصّہ ہوتا ہے۔ اس کے ہر سرے پر مستطیل قطعات (ان قطعات کے فرش مرکزی حصّے سے ایک زینہ اوپر ہیں) اس نقشہ کی ترتیب کی نقل معلوم ہوتے ہیں جس کے ابتدائی نمونے کا مرکزی حصّہ فیروز آباد کے محل کی طرح بالکل کھلا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی اسلامی گھروں میں قاعہ کا مرکزی حصّہ غیر مسقف چھوڑ دیا جاتا تھا۔ آگے چل کر عہد مملوک میں ان پر چھت ڈالا جانے لگا۔ لیکن بازوؤں کے قطعات سے نسبتاً بلند سطح پر بنائے جاتے تھے اور ان میں ایک چھوٹا سا قبہ یا قندیل بنائی جاتی تھی۔ اگرچہ عہد مملوک میں بازو کے قطعات پر سپاٹ چوبی چھت ڈالی جاتی تھی، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ ابتدائی گھروں پر قوسی لداؤ چھت ڈالی جاتی تھی۔ اس وضع کا مکان جس میں ایک صحن، ایک مقعد اور ایک قاعہ ہوتا ہے

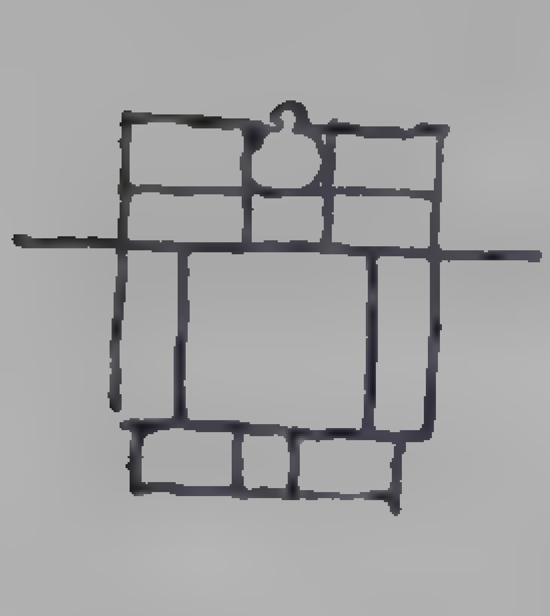


شکل ۳۲
اسلامی گھر میں قاعہ

عباسی عہد میں شام سے اور مصر میں ایران اور مسوپٹیمیا کی طرف سے آیا۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جب کہ ایرانی چیزیں فیشن میں داخل ہوگئی تھیں اور مصر یا کم سے کم اس کا پایہ تخت بہت بڑی حد تک ایران زدہ ہوگیا تھا۔ "ایوان" کی اصطلاح جو بگڑ کر مصر میں "لیوان" بن گئی فارسی لفظ ہے ایوان کی اصطلاح قاعہ کے مرکزی حصّہ کے ہر سرے پر کے مستطیلی قطعے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے خدوخال کی توضیح کرتی ہے جو بالکل ایرانی الاصل ہے بعض اوقات شام اور مصر کے خانگی مکانوں میں مدرسہ کے لئے موزوں گنجائش ہوتی تھی۔ ان مکانوں میں درس و تدریس کا کام دن کے وقت قاعہ کے ایوانوں میں ہوتا تھا، اور رات میں طالب علم ان مکانوں کی خواب گاہوں میں رہا کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس سے بھی پہلے کے ایشیائی مدرسوں کے لئے ایسے مکان استعمال کئے جاتے تھے۔ اسی لئے لوگوں کے ذہن میں قوسی لداؤ چھت کے ایوان کے ساتھ درس گاہ کا گہرا تعلق پیدا ہوگیا، اور یہ حال صرف مصر ہی کا نہیں بلکہ ہر جگہ یہی حال ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خانگی مکانوں کا استعمال ہمیشہ جاری نہیں رہا۔ ان مکانوں کے سوا مدرسوں کے لئے مخصوص عمارتوں کا مہیّا کرنا بھی ضروری تھا۔ ایسی اوّلین

عمارتوں کے کچھ آثار اگر کہیں باقی ہیں تو وہ شام میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے نقشے اس طرح ڈالے گئے ہیں کہ وہ مقام نماز اور مقام درس کی دہری ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ جہاں تک ان عمارتوں کے مقام نماز ہونے کا تعلق ہے یہ ایسی چھوٹی مسجدوں کی ترمیم شدہ شکل پر ہیں جن کا ایک نمونہ جامع الجیوشی ہے۔ لیکن ان میں حرم کی اہمیت گھٹا دی گئی ہے۔ اور اسے صرف ایک ہی کھانچے تک عمیق بنایا گیا ہے۔ اسی طرح اس کا عرض صحن کے عرض تک محدود کر دیا گیا ہے۔ الپّا (ALLEPPA) کا مدرسہ بختیا جو سنہ ۱۱۹۲ء میں تعمیر ہوا ہے، اس کی اچھی مثال ہے (شکل ۳۲) طلبہ کے حجرے صحن کے بازوؤں پر بنائے گئے ہیں، اور دیوار قبلہ کے مقابل آخری سرے پر ایک لداؤ قوسی چھت کا ایوان بنایا گیا تاکہ وہ تدریس کے کمرے کا کام دے سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ایوانوں کی مطلوبہ تعداد مضامین درس کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ صحن کے بازوؤں پر طلبہ کے حجروں کی ترتیب جامع ازہر کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں العزیز نے بازو کے ایوانوں کو طلبہ کی رہائش کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس نقشہ میں بہت سی بے آرامیاں تھیں۔ ایوانوں کو حذف کر دینے سے لوگوں کے لئے حرم تک



شکل ۳۲
شامی مدرسہ کا خاکہ

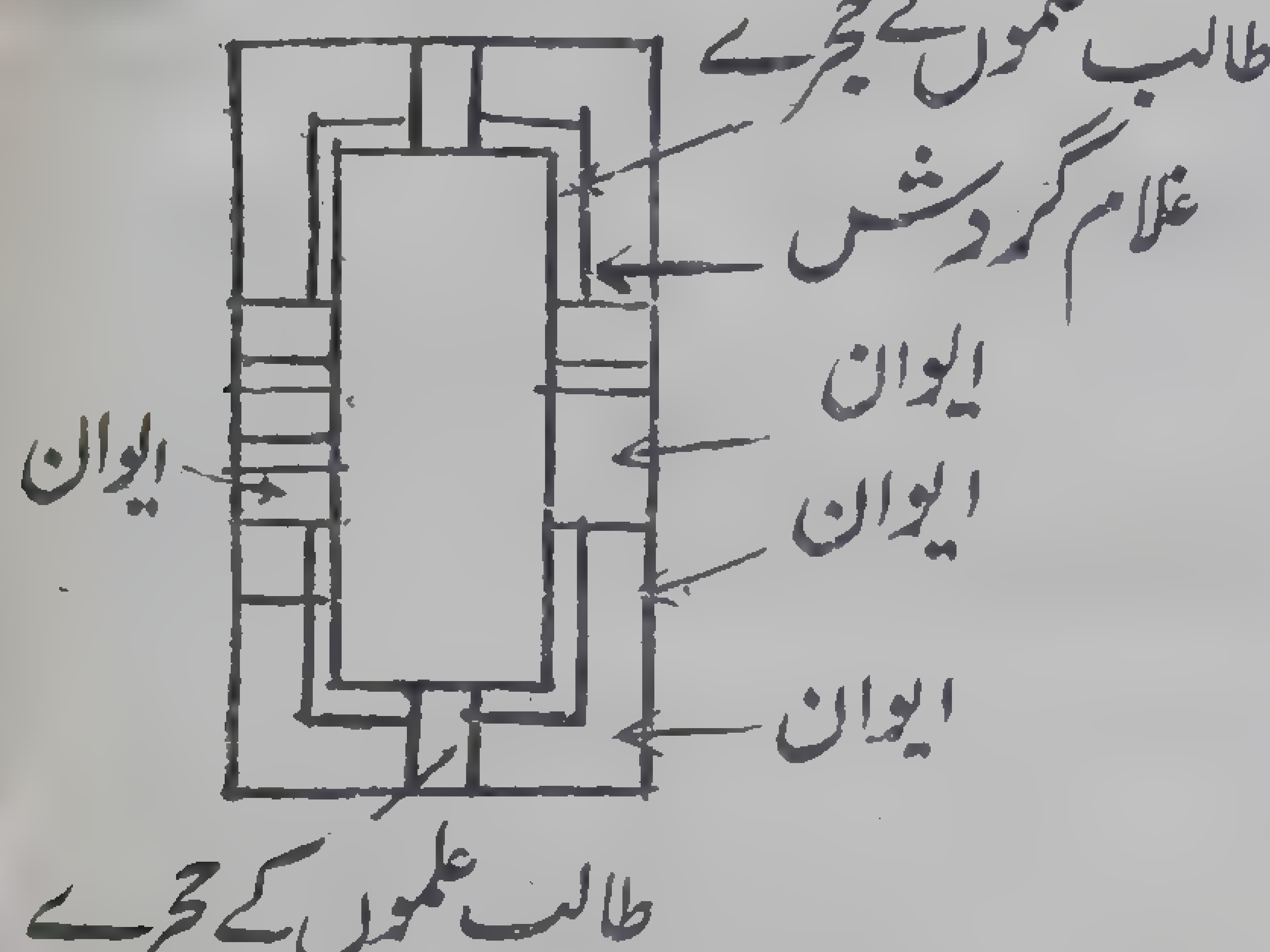
جانے کا سایہ دار راستہ باقی نہ رہا، اور صحن کی تعمیری ہم آہنگی برباد ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بے آرامیوں کو محسوس کیا گیا، کیونکہ مدرسہ طاہریہ میں جو بمقام حلب چھبیس[26] سال بعد سنہ ۱۲۱۹ء میں تعمیر ہوا، ان بے آرامیوں پر کسی قدر قابو پا لیا گیا ہے۔ یہاں صحن کے جنوبی اور شمالی بازوؤں پر ایوان بنائے گئے ہیں۔ ہر ایوان ستونوں پر اُٹھائی ہوئی تین کمانوں کے ایک چھتے پر مشتمل ہے۔ مدرسہ فردوس میں جو بہ مقام حلب سنہ ۱۲۳۵ء میں بنا، صرف آخری سرے کو چھوڑ کر صحن کے تینوں بازوؤں تک ایوانوں کو توسیع دی گئی ہے۔ اور آخری سرے پر ایک بڑا کمرہ ہے[5] لیکن یہ مسئلہ اس وقت تک تشفی بخش طور پر حل نہ ہو سکا جب تک کہ مسجد کے نقشہ میں حائل و مانع ہونے والی روایتیں ترک نہ کر دی گئیں اور ایک ایسا نقشہ جو مدرسہ کی جداگانہ ضرورتوں کی تکمیل کرتا تیار نہ کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ایرانی ایوان یا بڑے کمرے کو مسجد کے نقشہ میں منسلک کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ شام کی بہ نسبت مصر میں مدرسہ کا رواج دیر سے ہوا، اور مصر میں اس کے رواج کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان تعمیر کاروں نے شامی کوششوں کی ناکامی کو تسلیم کر لیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ مدرسہ کی تعمیر میں خانگی مکان کے

---

[5] ان مدرسوں کے نقشے کرسول کی محولۂ بالا کتاب میں دئے گئے ہیں۔

قاعہ کے نقشہ کو تدریسی اغراض کے لئے اختیار کر لینا قابل ترجیح ہے۔ اور نماز کے اغراض کے لئے اس کی ناموزونی گھٹانے کے لئے اس کو مکّہ کے رُخ بنایا جائے اور اس میں محراب بنا دی جائے۔ یہ ذراسی ترمیم جو اس لئے کی گئی تھی کہ بڑا کمرہ یا قاعہ تدریس کے سوا نماز کے بھی کام آسکے، شامی کوششوں سے زیادہ کامیاب رہی۔ شام میں اس سے پہلے درس گاہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسے نقشے کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو اصلاً عبادت گاہ کا نقشہ تھا۔ سنہ ۱۲۲۵ء کے لگ بھگ قاہرہ میں الکامل کا بنایا ہوا مدرسہ مصر میں پائے جانے والے مدرسوں کے آثار باقیہ کی اوّلین مثال ہے۔ لداؤ چھت کے بڑے کمرے یا ایوان کا بڑا حصّہ ابھی باقی ہے۔ اور ایک دوسرے ایوان کے بھی نشانات ملتے ہیں۔ مرکز صحن کے بازو اس کے لئے موزوں بنایا گیا تھا۔ طالب علموں کے کمرے مرکزی صحن کے بازوؤں کے برابر بنائے گئے تھے (شکل ۲۴)
اس مدرسہ کی تعمیر کے سات سال بعد سنہ ۱۲۳۲ء میں بہ مقام بغداد مستنصر کے بنائے ہوئے عظیم الشان مدرسہ میں نہ صرف طالب علموں کی شب باشی کا انتظام ملتا ہے، بلکہ چاروں سُنّی مذہبوں کی تعلیم اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مکتب حدیث اور سبع قراءت قرآن

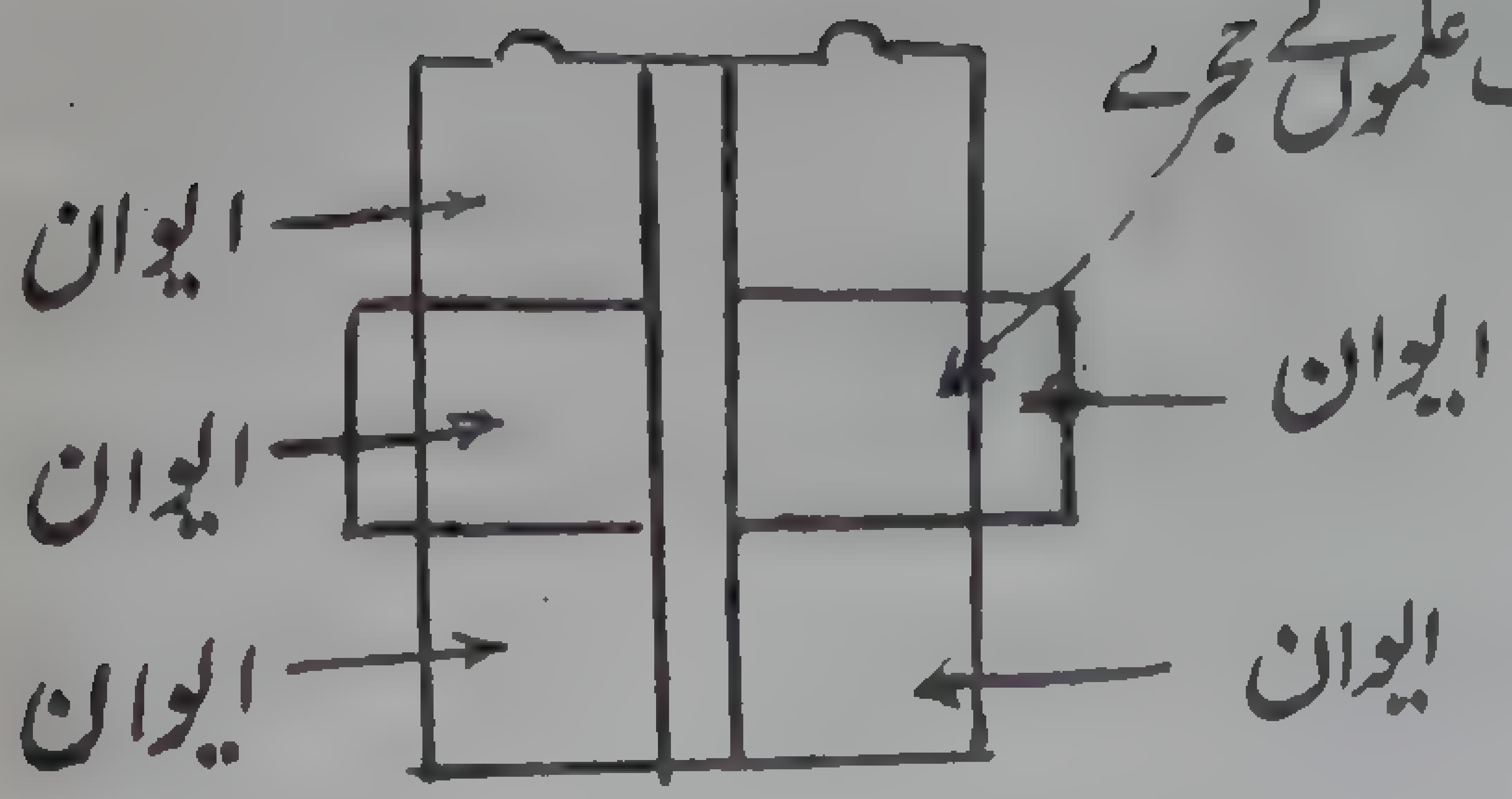
کی تعلیم کا بھی انتظام نظر آتا ہے۔ شکل ۴۵ میں نقشے کے اہم قد و خال کا ایک خاکہ دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کے تعمیر کار نے شامی نقشوں کی بہ نسبت اپنے مسئلہ کو حل کرنے میں زیادہ اپج اور زیادہ آزادی سے کام لیا ہے۔ درس کے کمرے بڑی حد تک قوسی لداؤ چھت کے ایوانوں کی صورت میں بنائے گئے ہیں۔ طالب علموں کے حجرے ایک بڑے مستطیل صحن کے گرد بنائے گئے ہیں۔ اس صحن کی مساحت طول میں تقریباً (۱۷۳) فیٹ اور عرض میں تقریباً (۷۰) فیٹ ہے۔ بڑے محور کے دونوں سروں پر قوسی لداؤ چھت کا ہال ہے۔ چھوٹے محور پر ایک ایسا ہی ہال ہے جو صدر کا کام دیتا ہے۔ اس کے دونوں بازوؤں پر (راستہ کی وجہ سے یہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے) لداؤ چھت کے ہال ہیں۔ مقابل میں ان ہالوں کے مجموعہ سے ہم آہنگ اور دو ہال ہیں۔ ان میں سے ایک قوسی لداؤ چھت کا ہے اور دوسرا تین کھانچوں پر مشتمل ہے اور متقاطع لداؤ چھتوں سے



شکل ۴۵ مدرسہ مستنصریہ میں ایوانوں کی ترتیب

پاٹا گیا ہے۔ یہ ہال ایک غلام گردش سے ملحق تھے۔ اس میں روشنی صحن کے ذریعہ آتی تھی۔ اور اس کے بیرونی رُخ سے طالب علموں کے حجروں میں جانے کا راستہ تھا۔ شمالی اور جنوبی ہالوں کے پشت پر اور ہال ہیں۔ یہ خاکے میں دکھائے نہیں گئے ہیں۔ مدرسہ صالحیہ قاہرہ، مدرسہ مستنصریہ بغداد کے دس سال بعد سنہ ۱۲۴۲ء میں تعمیر ہوا۔ اسے الکامل کے بھائی اور اس کے جانشیں سلطان صالح ایوب نے بنوایا تھا۔ یہ مدرسہ بھی چاروں فرقوں کی تعلیم کے نقشہ پر بنایا گیا تھا۔ مصر میں مدرسہ مستنصریہ بغداد کی شہرت تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صالح کے مدرسہ کے تعمیر کار نے اپنا منصوبہ جزوی طور پر اس مدرسہ سے اور دو فرقوں کے مدرسہ کے مقامی نقشے سے (جیسا کہ الکامل نے بنوایا تھا) اخذ کیا تھا۔ مدرسہ صالحیہ کا نقشہ (شکل ۳۶ب) دو فرقوں کے دو مدرسوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر ایک مدرسہ، مدرسہ کمالیہ جیسا ہے۔ اور یہ ایک دوسرے سے ایک غلام گردش کے ذریعہ الگ کئے گئے ہیں۔ یہ غلام گردش مدرسہ مستنصریہ کے نقشہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس مدرسہ میں اسی طرح ایک غلام گردش ایوانوں کو الگ کرتی ہے۔

مدرسہ صالحیہ کے جنوبی قطعہ کا جو کچھ حصہ بھی



شکل ۳۶ مدرسہ صالحیہ میں ایوانوں کی ترتیب

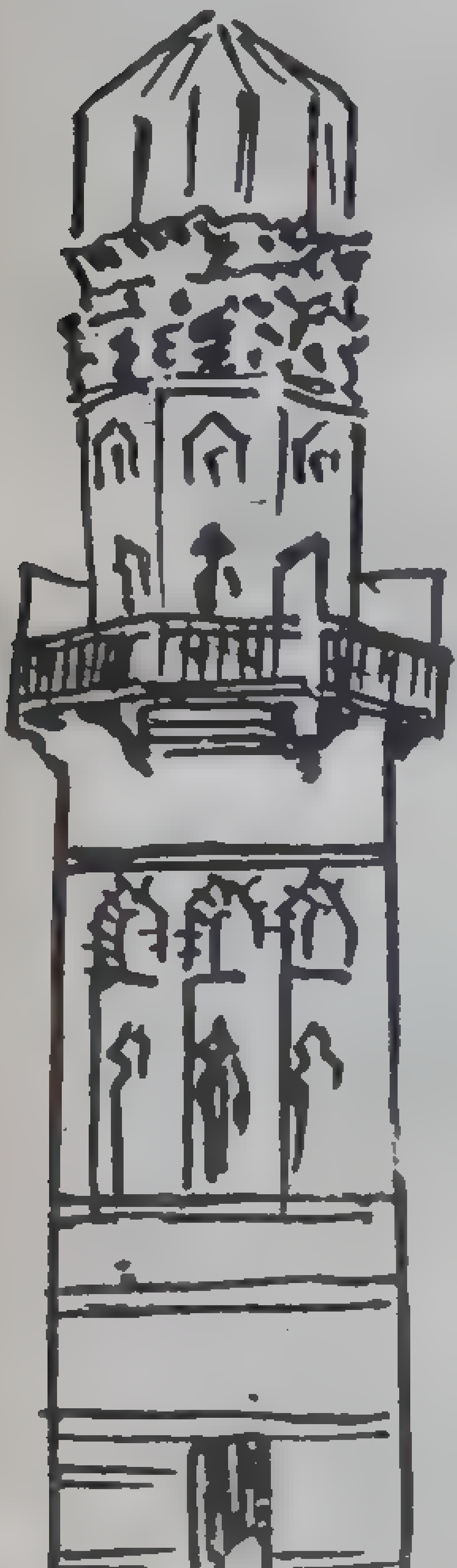
آج باقی رہ گیا ہے وہ مغربی پیش رُخ ہے۔ شمالی قطعے کا مغربی پیش رُخ اور اسی طرح بڑے بڑے مشرقی اور مغربی ایوان بھی قائم ہیں۔ مدرسہ صالحیہ سے متصل صالح نجم الدین ایوب کا مقبرہ اسی تعمیری مجموعہ (شکل ۳۷) کے ایک حصّہ کی حیثیت سے بنایا گیا ہے۔ کمانیں پیش رُخ کے دیواری پایوں پر اُٹھائی گئی ہیں۔ ان



شکل ۳۷ صالح نجم الدین کا مقبرہ

کمانوں کی شکل بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں استعمال شدہ کمانوں
جیسی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صالحیہ کا خاکہ بنانے
والے کو اس مدرسے کے ایک نقشے ہی نے متاثر نہیں کیا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں — گو شاذ ہی سہی — اور شام
میں مدرسہ کے ساتھ ایک مینار بھی بنایا جاتا تھا۔ صالحیہ کا
مینار بھی فاطمی دور کے آخر کی مسجدوں کی طرح باب الداخلہ کے
اوپر بنایا گیا ہے۔ صالحیہ کا پیش سنگ بستہ ہے لیکن اس کے مینار کو
اینٹ میں بنایا گیا ہے۔ مقبرے کے اوپر کا گنبد بھی اینٹ کا ہے۔
جامع الجیوشی میں بھی گنبد اور مینار دونوں اینٹ میں
بنائے گئے تھے اور پتھر صرف مرکزی دیواروں میں استعمال
کیا گیا تھا۔ قاہرہ میں یہ طریقہ کچھ دنوں تک مروج
رہا اور یہاں گنبد اور مینار کے اوپر کے حصے اس
وقت بھی اینٹ ہی کے بنتے رہے جب کہ عمارت کے
ہر حصے میں اینٹ کی جگہ پتھر نے ایک عرصے سے لے لی
تھی۔ پتھر کی بہ نسبت اینٹ ہلکا اور آسانی سے استعمال
ہونے والا مسالہ ہے۔ اس لئے بلندی پر لے جائے
اور گنبدوں اور مینار کے بالائی حصوں کی تعمیر میں
کام آسکتا ہے جہاں وزن کو جہاں تک ہوسکے کم
کرنا ضروری ہونے کے سوا سہولت بخش ہے۔ صالحیہ
کے مینار کی نچلی منزل (شکل ۳۸) کا نقشہ مربع ہے
اور بالائی منزل مثمن ہے۔ مینار ٹھوس بنایا گیا ہے

اور اس کی دیواروں میں وقفہ وقفہ سے چوبی جوڑ دئے گئے ہیں۔ مینار کی اسی ٹھوس تعمیر نے اسے سنہ ۱۳۰۲ء کے خطرناک زلزلے میں گرنے سے بچا لیا، حالانکہ اس زلزلہ میں جامع الحاکم کے میناروں کے بالائی حصّے گر پڑے تھے۔ مثمنی منزل کے اوپر جہاز کے پیندے جیسا ایک قبہ بنایا گیا ہے۔ یہ قبہ پسلی دار ہے، اور قلمی آرائش کے دو گھیروں کے سرے پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ گھیر مثمن کے دائرے میں عبور کے لئے پردے کا کام دے رہے ہیں۔ ہمیں اس قسم کی حد بندی اسّی سال پہلے بھی ملتی ہے[1] اور اسی قسم کے بالائی سرے والے مینار قاہرہ میں چودھویں صدی کے ابتدائی سالوں تک بنتے رہے[2] مینار بنانے کا یہ طرز مصر میں فاطمی دور کے آخر میں غالباً ایران یا مسوپٹیمیا سے آئی تھی۔



شکل ۳۸
مدرسہ صالحیہ کا مینار

صالحیہ مینار کے کمان دار دریچوں کے سروں کے اطراف شعاعی وضع کا قلمی کام ہے۔ اس قسم کی تزئین جو یہاں گچ میں ظاہر ہوئی ہے قاہرہ میں پہلی مرتبہ پتھر میں ظاہر ہوئی اور اسی طرح جامع الاقمار

[1] ۔مقبرہ ابو الغضنفر، قاہرہ، تعمیر شدہ سنہ ۱۱۵۷ء
[2] ۔مقبرۂ جوالیہ (سنہ ۱۳۰۳ء) اور خانقاہ مظفر بیبرس (۱۳۰۹ء)

کے پیش رُخ میں استعمال کی گئی ہے۔

مدرسہ صالحیہ صالح ایوب مصر پر فرانسیسی حملہ میں فوت ہوگیا۔ فرانسیسیوں کا یہ حملہ سینٹ لوئی کے تحت کیا گیا تھا۔ صالح ایوب کے بیٹے توران شاہ نے حملہ آوروں کو ملک سے نکال باہر کرنے کے کام کو مکمل کیا۔ توران شاہ کی وفات کے ساتھ ہی ایوبی خاندان جس کا بانی صلاح الدین اعظم تھا اور جس خاندان نے تقریباً ستّر سال تک فرمانروائی کی ختم ہوگیا۔ یہ زمانہ مصر اور شام دونوں ملکوں میں عیسائی حملہ آوروں کے خلاف جنگ اور اس کے ساتھ ہی بے دینیوں کے عقائد کے ساتھ کش مکش کا زمانہ تھا۔ مسجد کی تعمیر میں گھڑے ہوئے پتھر کا استعمال فاطمیوں کے عہد میں شروع ہوا تھا، اس کا استعمال اس دور میں بھی جاری رہا، لیکن اسے خشتی تعمیر کی قدیم تر روایتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اینٹ اب بھی قاہرہ میں تعمیر کا اہم مسالہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی فوجی کاموں میں سنگ راجوں کی بھی ضرورت تھی۔ شام اور فلسطین میں صلیبی حملہ آور صلاح الدین اور اس کے جانشینوں کے ہاتھوں زبردست ہزیمتیں اُٹھا چکے تھے پھر بھی یہ مصر اور شمال کے زبردست سنگی تعمیر کے علاقوں کے درمیان ایک بے خطر راستے میں مزاحم تھے۔ اس مزاحمت کا خاتمہ کرنا عہد مملوک اور سلطان صالح ایوب کے سابق غلام کی توانائی اور اس کی عزم ہمت کیلئے مقدر ہو چکا تھا۔

پانچواں باب
عہدِ مملوک

اسلامی فن تعمیر کی شاندار ترین یادگاروں کے جتنے سلسلے ہم تک پہنچے ہیں وہ بیشتر عہد مملوک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عہد تیرھویں صدی کے وسط سے لے کر سولھویں صدی کے ابتدائی سالوں تک تقریباً (۲۵۰) سال تک چلتا رہا۔ اس عہد کے خاتمہ سے پہلے پتھر نے پوری طرح اینٹ اور گچ کی جگہ لے لی تھی اور اینٹ اور گچ مصر میں اسلام کے بعد سے بہ حیثیت مجموعی مسجدوں کی تعمیر کے اہم مسالے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اینٹ اور گچ کی تعمیری روایتوں سے بہت سی اہم چیزیں حاصل کی گئی تھیں اور یہ مستثنیات تھیں جو سنگ کاروں کے مصر میں مسلسل منتقل ہوتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ مصر میں ان کا منتقل ہونا نتیجہ تھا یا تو مصری سلطنت کی سنگی تعمیر کے ملکوں تک عارضی وسعت کا یا سلجوق دباؤ کا جس نے شیعی صناعوں کو سنگی تعمیر کے ملکوں سے نکل کر مصر میں پناہ گزیں ہونے

پر مجبور کر دیا تھا۔
گیارھویں صدی کے آخر میں سلجوق حملے کے نتیجے کے طور پر آرمینیا اور اناطولیہ کے کم سے کم ایک حصّہ اور غالباً ایک بڑے حصّہ کے قبول اسلام نے مشرق قریب کے اسلامی فن تعمیر کو پتھر میں ظہور کا ایک نہایت اچھا موقع عطا کیا۔ تاہم اس موقع سے اس وقت تک فائدہ نہیں اُٹھایا گیا جب تک کہ مملوک فلسطین اور شام سے صلیبی حملہ آوروں کو نکال کر اور شام میں حامہ اور ساحل کے پہاڑی علاقوں میں بسنے والے حشیشیوں کے بے دین شیعی فرقے کو دبا کر بلا شرکت غیرے شام کے مالک نہ بن گئے اور اپنے اثر کو زیریں آرمینیا اور اناطولیہ تک نہ بڑھا لیا۔ مملوک سلطنت کی شمال میں وسعت اور صلیبی حملہ آوروں کو ساحلی شہروں سے نکال باہر کرنے سے مملوکوں کو نصرانی اور سلجوق فن تعمیر سے روشناس کر دیا۔ ان کی آخری فتح نے مملوکوں کو صناعوں کی ایسی ملی جلی جماعت کا حاکم بنا دیا جو سنگی تعمیر میں مہارت رکھتے تھے اور ان کے طریقے اور ان کی روایتیں ایک حد تک شمالی شام، اناطولیہ اور آرمینیا کے سلجوق فن تعمیر سے اخذ کی گئی تھیں۔ اس تعمیر کاری پر نہ صرف آرمینی اور بازنطینی روایات کا وراثتی اثر تھا بلکہ یہ تعمیر کاری ایسی تحریکوں سے بھی متاثر تھی جو اصلاً مسوپٹیمیائی اور ایرانی تھیں۔ مصر اور

شام میں مملوکوں کے مضبوطی سے قدم جما لینے سے انھیں یورپ سے منفعت بخش مشرقی تجارت پر قابو حاصل ہو گیا۔ اور اس طرح سے جو دولت حاصل ہوئی اسی نے مملوکوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ فنی ذرائع اور مختلف اصلوں اور خیالوں کی انتہائی ترقی یافتہ صناعت سے جواب ان کے قبضہ واختیار میں تھی، پوری طرح کام لیں۔ سنگی تعمیر کے ملکوں (شمالی شام، اناطولیہ، اور آرمینیا) کے فن تعمیر میں جو پہلے سلجوقوں کے زیر فرمان تھے، اور بعد میں ایرانی مغلوں کے زیر اثر آئے، اینٹ اور گچ کے رشتہ کی اور میسوپٹیمیائی اور ایرانی اصل کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اس طرح ان علاقوں میں مملوک سلطنت کی وسعت سے پہلے جذب کرنے کا یہ عمل اور ان شکلوں کی پتھر میں ترجمانی کا کام پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ اس عمل سے پیدا ہونے والے طریقے اور روایتیں اب مصر لائی گئیں۔ آگے چل کر یہی روایتیں شام اور فلسطین میں نصرانی فن تعمیر کی روایتوں سے آمیز ہونے والی تھیں، اور ادھر خود مصر میں انھیں روایتوں کو روایتوں کی ایک تیسری رو کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ اینٹ اور گچ کی تعمیر کاری (بڑی حد تک ایرانی اور میسوپٹیمیائی اصل کی تعمیر کاری) تھی جس سے ابن طولون کے عہد سے لے کر اب تک مصر میں مسجدوں کی تعمیر متاثر ہو رہی تھی۔ ان روایتوں کے تحت مصر میں مقامی طور پر جو

شکلیں پیدا ہوئیں یا کم سے کم وہ شکلیں جو موزوں تھیں، ان کی ترجمانی اب پتھر میں ہونے والی تھی۔ چنانچہ یہی صورت ایسی ہی اصل کی شکلوں کے ساتھ شام اور اناطولیہ میں پیش آچکی تھی۔ یہی پیچیدہ عمل اسلامی فن تعمیر کی ایسی بے مثل یادگاروں کا سلسلہ پیدا کرنے والا تھا جن سے عہد مملوک کو زینت تھی، اور اب بھی یہی یادگاریں قاہرہ کی دلکشی میں سب سے زیادہ کی حصہ دار ہیں۔

مملوک یا خاندان غلامان کی پہلی روا ایک عورت تھی بعض مورخوں کا بیان ہے کہ وہ ارمنی تھی۔ اس کا نام شجرۃ الدر یا "موتیوں کا درخت" تھا۔ یہ سلطان صالح ایوب کی کنیز تھی۔ صالح کے بیٹے توران شاہ (خاندان صلاح الدین کا آخری فرماں روا) کے قتل کے بعد مملوکوں نے اسے اپنی ملکہ منتخب کیا۔ اس کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے۔ یہ گنبد والی اینٹ کی عمارت جس پر استرکاری کی گئی ہے، غالباً سنہ ۱۲۵۰ء میں تعمیر ہوئی۔ سیدہ رقیہ کے مقبرہ کی طرح جو اس مقبرہ سے تقریباً ایک سو بیس سال پہلے تعمیر ہوا، اس مقبرہ میں بھی مربع سے دائرہ میں عبور خشتی طاقوں کی دو قطاروں کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن اس کا خاکہ زیادہ مرصع اور آویزہ زیادہ مکمل ہے۔ سیدہ رقیہ کے مقبرے میں معمار ایک مثمن جس پر گنبد اُٹھایا گیا تھا بناکر آسودہ ہوگئے۔ شجرۃ الدر کے مقبرہ میں یہ اور آگے

بڑھے۔ افقی سمت میں طاقوں کی تعداد بڑھائی گئی اور اوپر کے بندھن میں ایک مکمل دائرہ بنایا گیا۔ تزئین کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہا تا آں کہ خشتی طاقوں کی طرز کی جگہ بعد میں شام سے آئی ہوئی قلمی آرائش سے مزین توڑوں کی طرز نے لے لی۔

اگرچہ ملکہ شجرۃ الدّر مصر میں پہلی مملوک حکمران تھی لیکن اصل میں مملوک سلطنت کا بانی بیبرس تھا۔ یہ خود بھی صالح ایوب کا ایک غلام تھا۔ ایوبی عہد کے خاتمے پر سینٹ لوئی کے مقابلہ میں جنگ منصورہ میں اور بعد میں نہایت کامیابی کے ساتھ مغلوں کو پسپا کر کے اس نے بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ یہ مغل وہ تھے جو ہلاکو خاں کی سرداری میں سنہ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر ہجوم کر آئے، خلیفہ کو قتل کر دیا، اور دو سال بعد شام کے جنوب میں غازہ جیسے دور دست مقام تک وحشت و بربریت کا ایک سیلاب بہا دیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۶ء میں بیبرس نے صلیبیوں سے جافہ فتح کر لیا۔ اس نے شام اور مصر میں ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔ مملوک فوج کی تنظیم کی، بحریہ کی از سر نو تعمیر کی، سڑکیں اور پل بنوائے، شام کے قلعوں کو مضبوط کیا، دمشق اور قاہرہ کو برید کے ذریعہ جوڑا، اور ان دونوں شہروں میں ایک ہی ہفتے کے اندر چوگان

کھیلاؔ۔ قاہرہ کے شمال میں اس نے قدیم چو دیواری نقشہ پر ایک بڑی مسجد تعمیر کی۔ اس کے احاطے کی دیواریں اب تک قائم ہیں۔ اگرچہ اس کے چھتے گر پڑے ہیں، تاہم اس کے اندر کی ترتیب اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے نقشے کی داغ بیل ان اصولوں سے جو بیان ہو چکے ہیں، اور جو اس قسم کی بڑی مسجدوں کی تعمیر میں پیش نظر رکھے جاتے تھے، الگ نہیں ہے۔ یہ مسجد سنہ ۱۲۶۹ء میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ کوئی سوا ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں جو چوبینہ اور مرمر استعمال ہوا ہے اس کا کچھ حصہ جافہ کی نصرانی عمارتوں سے لیا گیا تھا۔ کیونکہ جافہ بیبرس کی فتح کے بعد زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔ اس مسجد کی دیواریں گھڑے ہوئے پتھر کی ہیں۔ اس کے نقشے کے زاویوں میں صحت پائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نقشے کا مصنف کسی سنگی تعمیر کے ملک سے آیا تھا۔ زاویوں کے اُبھار، مربع سنگی پائے، آگے کو نکلی ہوئی مربع پیش دہلیزیں، یہ سب چیزیں سلطان خاں کی سلجوقی کارواں سرا کی خصوصیات کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ سلطان خاں کی یہ کارواں سرا سنہ ۱۲۲۹ء میں قونیہ کے شمال مشرق میں تعمیر ہوئی تھی۔ تسمے سے مشابہ آرائشی کام کا جو نمونہ مغربی دروازے کے دلّے پر پایا جاتا ہے وہ سنہ ۱۲۲۰ء کی بنی ہوئی

[illegible]

قونیہ کی جامع مسجد کے دروازے کے اطراف ایک آرائشی کام سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اور یہی کام اسی شہر کے مدرسہ قراطائی کے کمان کے اوپر بھی بنا ہوا ہے۔ ستون کی ایک مربع کرسی اور گنگنی میں ایک تراش کا استعمال جو کلاسیکل کروگگر سے اخذ کی گئی ہے، شمال کے کسی سنگ تراش کی موجودگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ پیش دہلیز کی سنگ کاری میں ہلکے اور گہرے رنگ کے پتھر کی متبادل چنائی کی گئی ہے۔ اور یہ مصر میں پتھر کی دیوار کی سطح پر تنوع پیدا کرنے کی اس طرز کی یہ پہلی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ طرز پتھر اور اینٹ کے چند متبادل چنائی کے دوروں سے اخذ کی گئی ہے یا اس سے متاثر ہے۔ آگے چل کر یہ سراسینی یا اسلامی فن تعمیر کی ایک عام خصوصیت بن گئی۔ سنہ ۱۲۶۹ء میں اس مسجد کی تعمیر کا کام ختم ہوا، اور اسے ختم ہوئے مشکل سے ایک سال گذرا تھا کہ بیبرس نے انطاکیہ کو فتح کرکے ساحل شام کی صلیبی ریاستوں پر فتح یابی کے سلسلہ میں ایک اور کا اضافہ کیا تھا۔ اس کی فتوحات میں اسماعیلی فرقہ حشیشین کا زیر کرنا بھی تھا۔ یہ فرقہ کم و بیش نصرانی حکومت کا معاون تھا، اور اس کے استیصال میں صلاح الدین ناکام رہ چکا تھا۔ بیبرس کی مسجد اس حیثیت سے دلچسپ ہے کہ مصر میں اسلامی فن تعمیر مملوک

سلطنت کے مصر اور ایشیائے کوچک میں پھیلنے سے کتنی جلدی متاثر ہوگیا۔ کیونکہ بیبرس ایشیائے کوچک میں شہر قیصریہ تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں سلاجقہ دو صدیوں تک حکمران رہے لیکن اس زمانے میں وہ یہاں ایرانی مغلوں کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔

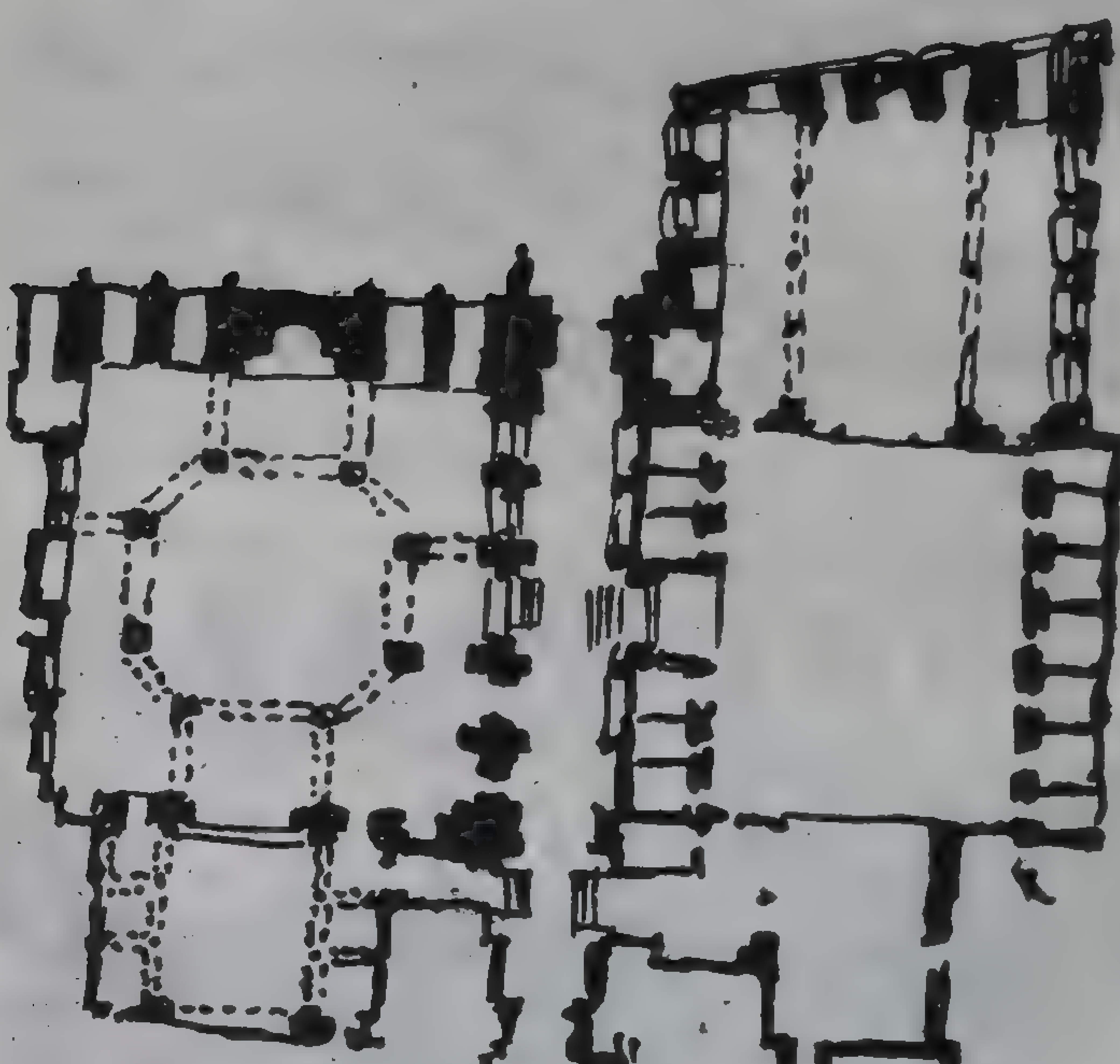
بیبرس کے قائم کردہ مملوک سلطنت کو اس کے جانشین قلاؤں نے جو بیبرس کا ایک سپہ سالار تھا، اور بھی بڑھایا۔ قلاؤں نے شمالی شام کے ساحلی شہروں میں صلیبیوں کی طاقت کو جو اس وقت بڑی حد تک قابل نظر انداز ہوگئی تھی، اور بھی گھٹا دیا۔ اس نے مغلوں کو ایک فاش شکست دی حالانکہ مغلوں کو اب تک کہیں شکست کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے تعلقات قسطنطنیہ اور فرانس سے دوستانہ تھے۔ اس نے صقلیہ اور قشتالیہ سے دفاعی اتحاد کیا۔ اس نے جنیوا کے ساتھ ایک تجارتی عہد نامہ مرتب کیا۔ اس نے نوبیا اور زیرین آرمینیا کے بادشاہوں سے خراج وصول کیا۔ لنکا کے حکمران نے اس کے پاس سفارت بھیج کر تجارت اور جہازوں کا پیش کش کیا۔ یہ تاجروں کو مصر سے دل کشی پیدا کرنے کے لیئے اس نے تمام ذرائع استعمال کئے۔ اس کے جاری کئے ہوئے راہ داری کے پروانے چین اور ہندوستان تک چلتے تھے۔[۵] مشرق سے مغرب اور اسی

۵۔ اسٹینلی لین پول۔ نحو لز سالوں کتاب۔

طرح مغرب سے مشرق کی تمام تجارت کا راستہ اس کی سلطنت کی حدوں سے ہوکر گذرتا تھا۔ سنہ ۱۲۸۴ء اور سنہ ۱۲۸۵ء میں قلاؤں نے مصر میں عمارتوں کا ایک عظیم الشان مجموعہ تعمیر کرایا۔ اس مجموعہ میں ایک شفا خانہ، ایک مدرسہ اور خود اس کا مقبرہ شامل تھا۔ ان عمارتوں میں سے مقبرہ اس وقت سب سے اچھی حالت میں ہے۔ یہ گوتھک، موری، سلجوقی یا شمالی شامی جیسے مختلف اثرات کے مجموعہ کی پیداوار ہے۔

مقبرہ کے نقشہ میں (شکل ۳۹ء) ایک گنبددار مثمن ہے جو ایک مربع نقشے کے کمرے پر اُٹھایا گیا ہے۔ یہ نقشہ عذرا (EZRA) کے قبل اسلام شامی کلیسا سینٹ جارج کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مربع کمرہ یا ہال ساٹھ فیٹ چوڑا ہے اور جو دیواریں اسے گھیری ہوئی ہیں وہ کوئی چالیس فیٹ اونچی ہیں۔ ان دیواروں میں دریچوں کی تین قطاریں نکالی گئی ہیں۔ فرشی سطح پر ان دریچوں کے موکھوں میں سپاٹ سرولین چڑھائی گئی ہیں (شکل ۴۰ء) اوپر کی قطار میں جو دریچے ہیں وہ جوڑوں کی صورت میں روشن دانوں کے بیچ سے ایک ستون دے کر بنائے گئے ہیں۔ یہ گول سری دریچے ہیں۔ اور ستون کے اوپر ایک مدور روشن دان نکالا گیا ہے۔ درمیانی قطار کے دریچوں کے موکھوں میں نوک دار کمانیں ہیں۔ جوڑ بندی

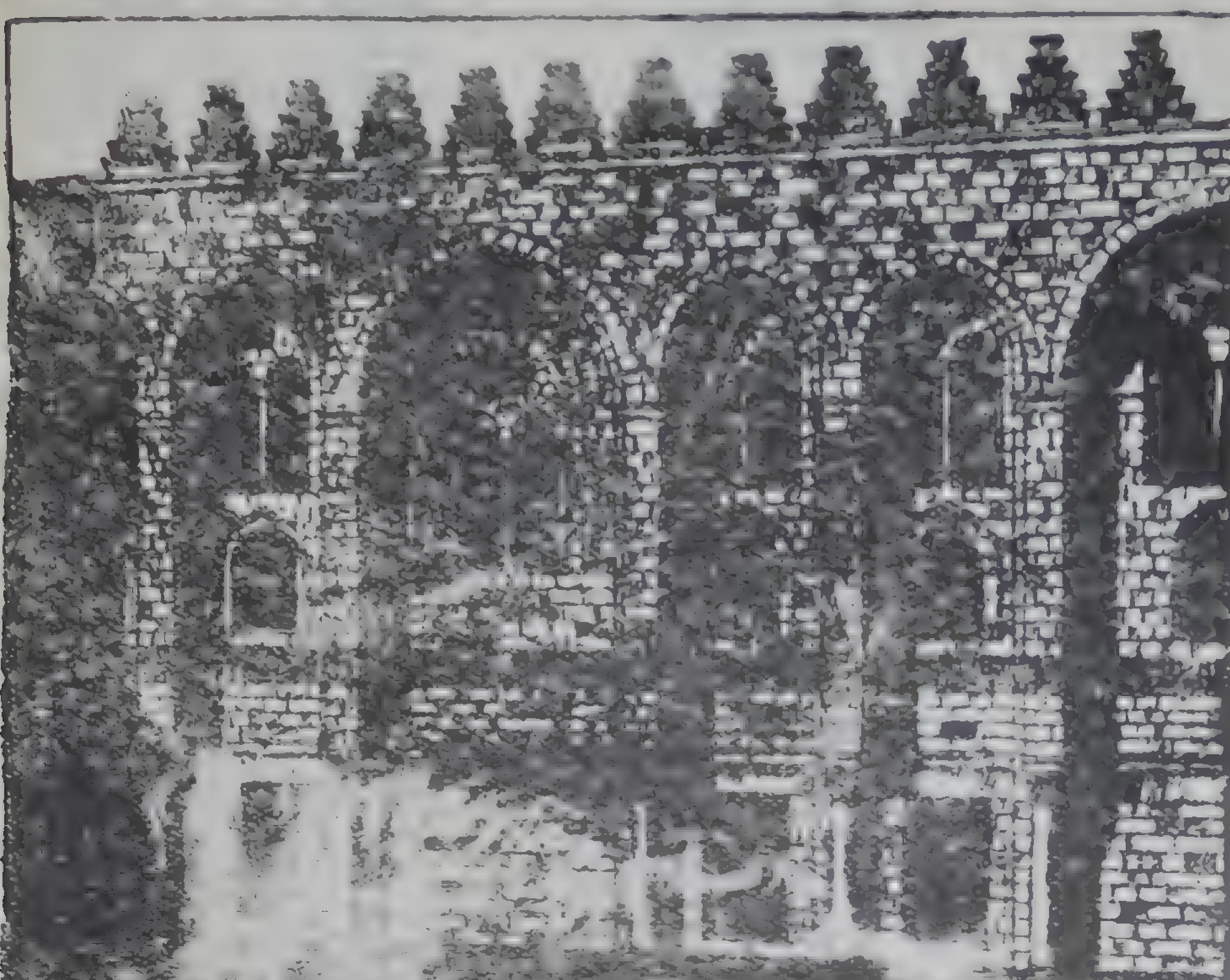
جو اتفاقاً ان دریچوں کے سروں میں سے گذرتی ہے، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ کمانیں دیوار کی تعمیر کے بعد بنائی گئی ہیں۔ اس ہال کے اندر مثمنی نقشے کا ایک چھتنا بٹھایا گیا ہے۔ اُس کا قطر تیس فیٹ ہے اور یہ آٹھ سہاروں پر اُٹھائی ہوئی آٹھ نوک دار اور قدرے گھوڑ نعلی وضع کی کمانوں پر مشتمل ہے۔ ان سہاروں میں چارونی مربع پائے ہیں۔ اور چار سرخ سنگ خارا کے ستون ہیں۔ ان ستونوں کی



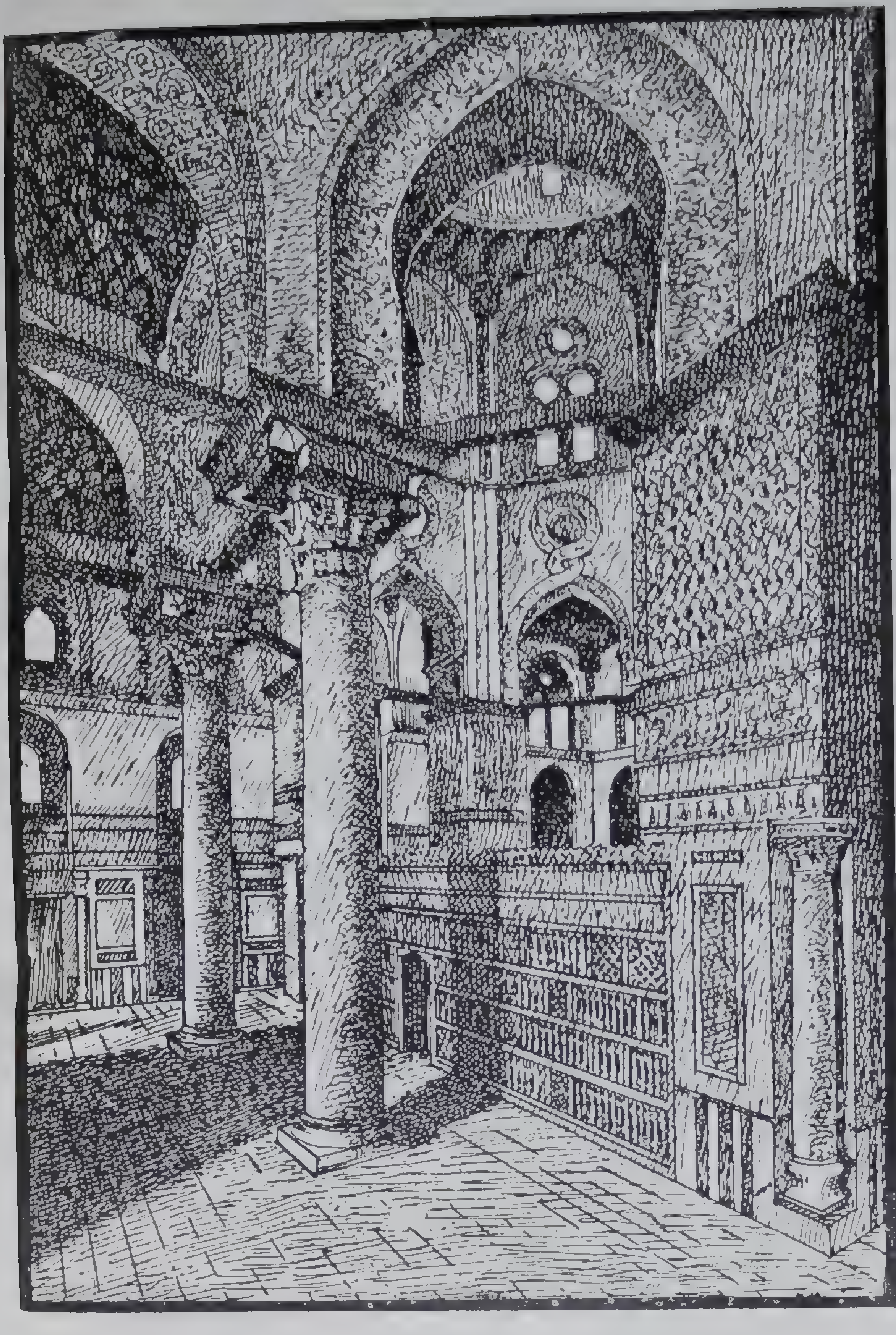
شکل ۲۹ سلطان قلاؤں کے مدرسے اور مقبرے کا نقشہ

چوکیاں اور سرِ ستون کورنتھین وضع کے ہیں (شکل ۴۱) بیرونی دیوار اور مثمن کی درمیانی جگہ پر ایک پاٹ چوبی چھت ڈالا گیا ہے جس کے نیچے دھنسے ہوئے دتے کی ایک چھت گیری ہے۔ ایک مثمنی ڈھولنا آٹھ کمانوں کے اوپر اُٹھایا گیا ہے اور یہ سپاٹ چھت سے قابل لحاظ

بلندی تک اوپر اُٹھا ہوا ہے۔ ڈھولنے میں جوڑی دار دریچوں کے آٹھ مجموعے اور ویسے ہی مدور روشن دان ہیں جیسے کہ بیرونی دیوار کے بالائی حصہ میں ہیں۔ ڈھولنے کے اوپر ایک گنبد ہے۔ یہ گنبد حالیہ تعمیر ہے کیونکہ قدیم گنبد کسی وقت گر پڑا تھا جس کی تاریخ معلوم نہیں ہے۔ بیرونی طور پر کمانوں سے لگے ہوئے دیواری پائے (شکل ۴۰) قدرے غیر مسلسل طور پر روکار کو کئی کھانچوں یا ایسے اتھل طاقوں میں تقسیم کرتے ہیں جن کے اندر دریچے بٹھائے گئے ہیں۔ دیواری پائے دو طرح کے ہیں، ان میں سے اندرونی اور چوڑی طرز کے پایے سطح زمین



شکل ۴۰ مقبرۂ تلاکوں کا بیرونی رُخ



شکل نمبر ۱۴- سلطان قلاؤں کے مقبرہ کا اندرونی رخ

سے کمانوں کی جبت تک چلے گئے ہیں اور بیرونی پایے اندرونی پایوں کے اوپر لگے ہوئے ستونوں پر اُٹھائے گئے ہیں۔ یہ ستون، ان کے سرستون اور ان کی چوکیاں سب کی سب رومی دنیا کے زمانے کے ہیں۔ سرستون کے اوپر ایک گردنے کا حاشیہ ہے۔ یہ حاشیہ دیوار کی سطح کی طرف مڑ جاتا ہے اور کور کی طرح ہر کھانچے کی سطح پر اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دریچوں کی سب سے نچلی قطار کی سرولوں کے اوپر افقاً چلا گیا ہے۔ ایسی ہی تراش کے حاشیے (کلاسیکی کروی کگر سے ماخوذ) دیواری کمانوں کی جبت پر دیئے گئے ہیں۔ دیوار کے سرے پر ایسی ہی تراش کی کگر ہے جس کے اوپر گھڑ گچے چڑھائے گئے ہیں۔ اس پیش رُخ کو قاہرہ میں اس سے پہلے کی کسی عمارت میں تلاش کرنا ناممکن ہے۔ یہ کسی ایسی طرز کی ارتقائی صورت نہیں جس کی ابتدائی صورت پہلے سے مقامی طور پر پائی جاتی ہو۔ فن تعمیر اور خاص کر اسلامی فن تعمیر کے مسائل سے بحث کرتے وقت قومی نقطۂ نظر پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

صالح ایوب کا مقبرہ جو قلاؤن کے مقبرے سے (۲۵) سال پہلے کی عمارت ہے اس کی دیواری کمانیں ایرانی وضع کی ہیں اور یہاں دیواری کمانیں گوتھک طرز کی ہیں۔ دیوار کے بالائی حصّہ میں جوڑی دار روشن دان اور اس

کے ساتھ اوپر ان کے مدور موکھے اور حاشیہ کے گرد لنے اور کورین اسلامی فن تعمیر میں نئی چیزیں ہیں۔ یہ شام میں صلیبیوں سے جنگ کی وجہ سے نصرانی فن تعمیر سے تماس کا نمایاں نتیجہ ہیں۔ مجموعی حیثیت سے روکار (شکل ۴۰) کچھ اس قسم کا ہے جو دریچوں کے موکھوں میں لگے ہوئے ہندسی نمونوں کی گچ کی جالیوں اور روکار کے اطراف لگے ہوئے نہایت نفیس کتبوں اور قدرے مضحک مشرقی گھڑ گچوں کے باوجود نصرانی فن تعمیر سے غیر معمولی طور پر مشابہت رکھتا ہے۔ پایوں کے درمیان بنے ہوئے طاقوں کے اندر دریچوں کا اجتماع نقشے کا ایک ایسا اصول ہے جو اسلامی فن تعمیر میں پہلی مرتبہ یہاں نمودار ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ اصول قاعدہ کلیہ بن گیا۔ جامع بیبرس کی طرح ایک زاویہ کا ستون باب الداخلہ پر بنی ہوئی کمان کو دونوں بازوؤں پر سہارے ہوئے ہے۔ اس کمان کے شانۂ کمان میں مستطیلی گتھا ہوا تسمے کی وضع کا وہی نمونہ ہے جو جامع بیبرس میں ظاہر ہوا ہے۔ اور اس سے بھی پہلے قونیہ میں ملتا ہے۔ تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ خصوصیات شامی اصل کی ہوں کیونکہ جامع قونیہ کے تعمیر کار کا نام محمد ابن قلاّن الدمشقی تھا۔ باب الداخلہ کی کمان گھوڑ نعلی وضع کی ہے۔ عہد اسلام کی اوّلین گھوڑ نعلی کمانیں وہ ہیں جو دمشق کی اموی جامع کبیر

میں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ وہ وضع ہے جس کو اندلس کے اموی حکمران خاندان کے تحت خوب فروغ حاصل ہوا اور یہ کمان اندلس اور شمالی افریقہ کے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیت بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیبرس کی شہرت اور دولت شام اور اناطولیہ سے بھی آگے کے ملکوں کے صناعوں کو قاہرہ کھینچ لائی تھی۔ ہمیں مینار کی وضع میں ان کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے (شکل ۴۲ ب) اس عہد میں ایرانی اصل کی مضحک شکلیں جس کا ایک نمونہ صالح ایوب کا مینار ہے اور ان شکلوں کے ساتھ ان کی پیچیدہ قلمی آرائشیں بھی ترک کر دی گئیں۔ صناعوں کا وہ مکتب جو اس قسم کے مینار بنایا کرتا تھا اب بھی قاہرہ میں موجود تھا، کیونکہ ہم بعد کی تاریخوں میں ان کے کام کا نمونہ پھر دیکھتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلاؤن کے مینار کے لئے مقامی صناعوں سے کچھ زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ اس کام کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شامیوں، اناطولیوں، اور شمالی افریقیوں کو ترجیح دی۔ مینار تین منزلوں میں بنایا گیا ہے۔ پہلی اور دوسری منزل مربع اور تیسری منزل مدور نقشے کی ہے۔ مثمن موجود نہیں ہے۔ مربع شکل شامی، شمالی افریقی اور اندلسی خصوصیت ہے۔ پہلی منزل میں مدور دریچے اصل روکار کے دریچوں کی طرح بے شبہہ شام کے نصرانی فن تعمیر سے متاثر

ہیں۔ دوسری منزل میں گھوڑ نعلی کمانیں شمالی افریقی شکل کی ہیں۔ تیسری منزل کے چھنے ہوئے چھتے اور گتھا ہوا نمونہ یہ دونوں بھی شمالی افریقی اور اندلسی میناری تعمیر کاری کی خصوصیت ہے۔ ان شکلوں کے مختلف نمونے، مثال کے طور پر، مراکش میں حسن الرباط کے مینار اور سیویلی (SEVILLE) میں مینار جیرالڈا (GIRALDA) میں ملتے ہیں۔ ڈھولنے کو اٹھانے والی کمانوں کی وضع (شکل ۴۱) قیروان کی جامع مسجد میں ابراہیم ثانی الدغالبی کی اضافہ کردہ کمانوں سے مشابہ ہے۔ سنگ خارا کے یک سنگی ستون اور ان کے سرستون اور چوکیاں بے شبہہ کسی یونانی یا رومی عمارت سے لی گئی ہیں۔ کمانوں کے گردنے اٹھانے کے لئے یہ سرستون کافی جگہ مہیّا نہیں کرتے، اس لئے



شکل ۴۲
قلاؤں کا مینار

وزنی چوبی شہتیر ان پر چڑھائے گئے ہیں۔ اور چونکہ یہ سرستون کے آگے کافی حد تک اُبھرے ہوئے ہیں اس لئے گردنوں کو اُٹھانے کے لئے یہ کافی جگہ مہیّا کرتے ہیں۔ دیواروں کا زیریں حصّہ مرمر کے حاشیہ یا "وزارا" اور پچی کاردتوں سے پٹا ہوا ہے۔ اس میں رنگین مرمر اور سیپ کے ٹکڑے

لگے ہوئے ہیں۔ مصر میں اس قسم کی پچی کاری کی یہ اوّلین مثال ہے۔ غالباً یہ شام سے آئی ہے۔ یہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعت بن چکی تھی، اور یہاں یہ اتنے کمال اور اتنی خوبی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے کہ بعد کے دوران میں اس سے اچھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ محراب بھی مرمر اور پچی کاری سے خوب ہی مزین کی گئی ہے اور اس کے پہلوؤں میں سنگ سماق کے نہایت نفیس ستون دئے گئے ہیں۔ دیواروں کے بالائی حصّے پر استرکاری کی گئی ہے۔ اور کمانوں کو استرکاری میں بنے ہوئے نمونوں سے خوب آراستہ کیا گیا ہے۔ مثمن کی کمانوں میں ان کی اندرونی جانب ایک پٹی کے ذریعہ تزئین کی گئی ہے۔ یہ پٹی چوٹی پر ایک روزن بناتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ تزئین کی یہی شکل قاہرہ میں پہلی دفعہ سنہ ۱۰۸۵ء کی تعمیر شدہ جامع الجیوشی کے محراب پر ملتی ہے۔ یہ سنہ ۱۰۵۱ء کے قریب کے بنے ہوئے قونیہ کے مدرسہ رنجے مینارالی کے دروازے پر بھی ملتی ہے، لیکن یہاں پتھر کی شکل میں ملتی ہے۔ ممکن ہے اس کی اصل آرمینی ہو۔ آگے چل کر پتھر کی عمارت میں اس کی تزئین ہونے والی تھی۔ مقبرۂ قلاؤں میں نقش و نگار اور میناکاری سے بھی کام لیا گیا تھا۔ ستونوں کے سرِستون پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے اور دھنسی ہوئی چوبی چھت گیری پر نقش و نگار بنائے

گئے تھے۔ کمانوں اور دیواروں پر کی استری تزئین بھی بے شبہ نہایت رنگین تھی۔ دریچے دہرے تھے، دریچے کے موکھوں کے بیرونی سروں پر استرکاری میں بنی ہوئی جالیاں تھیں اور اندرونی موکھوں پر ہندسی اور نباتی نمونوں میں کٹے اور استر میں بٹھائے ہوئے رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ دریچوں کی سب سے نچلی قطار میں باہر کی طرف کانسے کی جالیاں اور اندر کی طرف تہ ہونے والے دلّوں کے کواڑ لگے ہوئے ہیں۔ گنبد کے نیچے قبر ہے، اور یہ ایک چوبی مقصورے سے گھری ہوئی ہے۔ یہ مقصورہ مستطیلی شکل میں تراشیدہ لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ اندرونی کمانوں، ڈھولنے اور گنبد (یہ سب کے سب اینٹ کے ہیں) کے سوا ہر جگہ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔

ایک غلام گردش (شکل ۳۹) مقبرہ اور مدرسہ کو جدا کرتا ہے اور اسی سے دونوں میں جانے کا راستہ ہے۔ مدرسہ میں ایک کھلے صحن کے دونوں بازوؤں پر دو ایوان ہیں، ان کے بازوؤں پر طلبہ کے لئے دو منزلہ حجرے بنائے گئے ہیں۔ مغربی ایوان اب تک کے مروجہ طریقہ کے مطابق قوسی لداؤ چھت کا ہے۔ یہ صحن کے برابر چوڑا نہیں ہے، اور دروازے کے لئے دونوں بازوؤں پر جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ ان دروازوں میں سے ایک میں سے ہو کر اصل غلام گردش

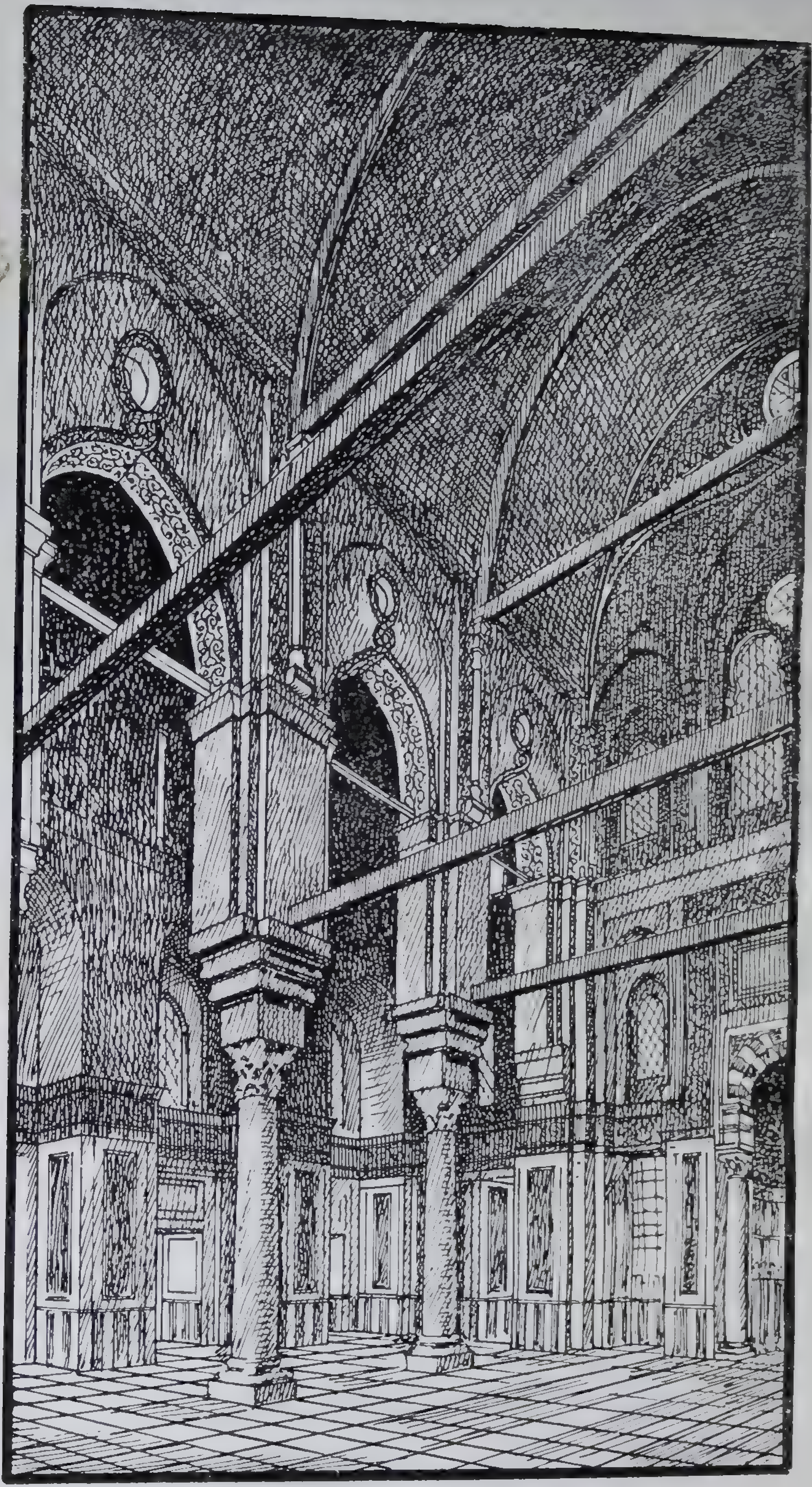
کو اور دوسرے میں سے ہوکر صحن تک راستہ جاتا ہے جس
میں وضو کیا جاسکتا ہے۔ مشرقی ایوان صحن کی بہ نسبت زیادہ
چوڑا ہے۔ اس کی وضع مقبرہ کے پیش رُخ کی طرح بالکل
واضح طور پر شام کے نصرانی فن تعمیر سے متاثر نظر آتی
ہے۔ چھت دو چھتّوں پر ڈالا گیا ہے جو جگہ کو ایک صدر
دالان اور دو بغلی دالانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ہر چھتے
میں چار کھانچے ہیں۔ چھتوں کو سہارنے والے ستون، ان
کے سرستون اور چوکیاں سب کے سب کسی قدیم عمارت
سے لئے گئے ہیں۔ سرستون پر (شکل ۴۲) پتھر کے مکعب
بٹھائے گئے ہیں۔ یہ مکعب قدرے بھدّی وضع میں گھڑے
ہوئے پتھر کے چوکے اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ کافی چوڑے
ہیں اور ایک وزنی سنگی گردنے کو سہارتے ہیں۔ اس
گردنے کو اور آگے بڑھایا گیا ہے، اور اس کے سرے
پر ایک سپاٹ زینہ نما حاشیہ ہے۔ یہ زینہ نما حاشیہ اس
طرح بارہ زاویے بناتا ہوا گھوم جاتا ہے۔ کمانوں کا
عرض پایوں کے عرض کے مساوی ہے۔ اصل صدر دالان
کی چھت گیری سپاٹ اور حالیہ زمانے کی ہے۔ یہ ابتدائی
چھت گیری سے نیچی سطح پر لگائی گئی ہے۔ ابتدائی چھت
گیری نیم استوانی سری اور چوبی تھی۔ اس کی تزئین کس
طرح کی گئی تھی اس کا علم نہیں، لیکن اندازہ کیا جاسکتا
ہے کہ یہ حاشیہ دار اور منقش جسّو (GESSO، ایک قسم کا

پلستر جو مصوری اور سنگ تراشی میں استعمال ہوتا ہے) سے
پٹی ہوئی تھی۔ صدر دالان کی کمانوں کے اوپر دیوار اُٹھائی
گئی ہے اور دیواری کمان کے سروں کے اوپر ختم کردی
گئی ہے۔ اس کی نچلی سطح بتدریج گردنے کے سرے پر
زینہ نما حاشیہ کے ابھرے ہوئے حصّہ پر جاکر ختم ہو جاتی
ہے۔ دالان کی کمانوں اور ان کے اوپر دیواری کمانوں
کی درمیانی جگہوں میں نیم مدور موکھے کاٹے گئے ہیں۔
زینہ نما گردنے کے حاشیہ کے اوپر دالان کی طرف ٹیکے دئے
گئے ہیں۔ یہ ٹیکے مرمر کے دھرے اور سرستون اٹھائے
ہوئے ہیں۔ جو چھت کو اُٹھانے والی چوبی صدر کڑیوں
کو سہارنے کے لئے بنائے گئے تھے اور چھت کے گرنے سے
پہلے واقعتاً سہارتے بھی تھے۔ اسی طریقے پر توڑوں پر
اُٹھائے جانے والی چوبی چھتیں پانچویں اور چھٹی صدی
کے شامی کلیساؤں میں ملتی ہیں "کلب لوزہ" کا کلیسا
اسی کی ایک مثال ہے۔[۵]

قلاؤں کا مقبرہ اور مدرسہ بلندی حاصل کرنے کی
ایک نئی کوشش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ساتویں صدی
کے ربع آخر میں کوفہ میں دوسری مسجد کی تعمیر سے لے کر
ہمیشہ (اوروں کی طرح) مسلمان معماروں کا یہی عزم
رہا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا عزم تھا جو بڑی حد تک

---

۵ Cyrie Central, Devogue.



شکل نمبر ۴۳- مدرسہ قلاؤں کا مشرقی ایوان- چوبی قوسی
لداؤ چھت اب موجود نہیں ہے

پورا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ مسجد کا ابتدائی نقشہ جس کا اہم عنصر قدیم عمارتوں سے لئے ہوئے ستونوں کا جنگل (عام طور پر یہ ستون معمولی الباد کے ہوتے تھے) ہوتا ہے ایسی چیز نہیں جو کامیابی کے ساتھ بلندی حاصل کرنے میں ممد و معاون ہو سکے۔ دمشق کی جامع امویہ کے معمار خوش نصیب تھے کہ انھیں اپنے چھتّوں کے لئے غیر معمولی طور پر اونچے ستون مل گئے۔ ان چھتّوں پر ایک دیوار بنا کر جس میں روشن دان کاٹے گئے تھے، انھوں نے نہایت سادہ طریقوں سے کافی بلندی حاصل کرلی۔ شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قابل حصول ستون بہت ہی کوتاہ تھے۔ یہاں کی کمانوں کو اونچا کرکے یہ مقصد حاصل کیا گیا۔ اور افقی چوبی شہتیروں کے ذریعہ انھیں ضروری استحکام بخشا گیا۔ قرطبہ میں یہی مقصد ایک اور طریقے سے حاصل کیا گیا۔ یہاں بھی گردنوں کو آگے بڑھایا گیا۔ لیکن یہاں کمانوں کی ایک نچلی قطار بڑھائی گئی۔ فاطمیوں کی بنائی ہوئی مساجد الازہر اور صالح ایوب میں قیروانی طریقہ کی پیروی کی گئی۔ لیکن بلندی یا بلندی کا ایسا اثر جو کسی نصرانی کلیسا سے مقابلہ کر سکے حاصل نہ ہو سکا۔ اپنے عظیم الشان مقبروں میں مدرسہ کی ابتدا اور اس کی ترویج میں مملوکوں نے جو جوش و خروش دکھایا اس کی وجہ سے نئی نئی صورتیں نکل آئیں۔ اگرچہ بازو کی دیواریں

کافی ٹھوس بنائی جاتی تھیں، لیکن مدرسہ کے نقشے کا قوسی لداؤ چھت کا ایوان کسی بھی مطلوبہ بلندی تک اٹھایا جا سکتا تھا۔ یا مدرسۂ قلاؤں کی طرح نصرانی نقشے پر عمارت اٹھاکر اور جگہ کو چھت کے ذریعہ دالان اور بغلی دالانوں میں تقسیم کر کے بلندی حاصل کی جا سکتی تھی۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ مدرسۂ قلاؤں صرف ایک استثنا کے سوا[۵]، مسلمان تعمیر کاروں کے اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کی واحد مثال پیش کرتا ہے۔

قلاؤں نے سنہ ۱۲۹۰ء میں انتقال کیا۔ قلاؤں کے بعد اس کا بیٹا خلیل اس کا جانشین ہوا۔ خلیل کا دور حکومت صرف تین سال رہا۔ لیکن اس کا دور حکومت اس اہم واقعہ کی وجہ سے یادگار ہے کہ فلسطین میں عکہ یا سنٹ جین ڈی اکرے (ST. JEAN D' ACRE) پر حملہ کر کے اسے فتح کیا گیا، اور باقی تمام شہروں نے جو صلیبیوں کے قبضے میں تھے، یا تو اطاعت قبول کر لی یا زیر کر لئے گئے۔

آنے والے پچاس سالوں میں دو مختصر سے وقفوں کے ساتھ قلاؤں کے ایک اور بیٹے الناصر محمد نے مملوک سلطنت پر حکمرانی کی۔ سنہ ۱۳۰۳ء میں اس نے چاروں سنّی مکاتیب خیال کے لئے قاہرہ میں ایک مدرسہ

---

[۵] مدرسۂ سلطان برقوق سنہ ۱۳۸۶ء

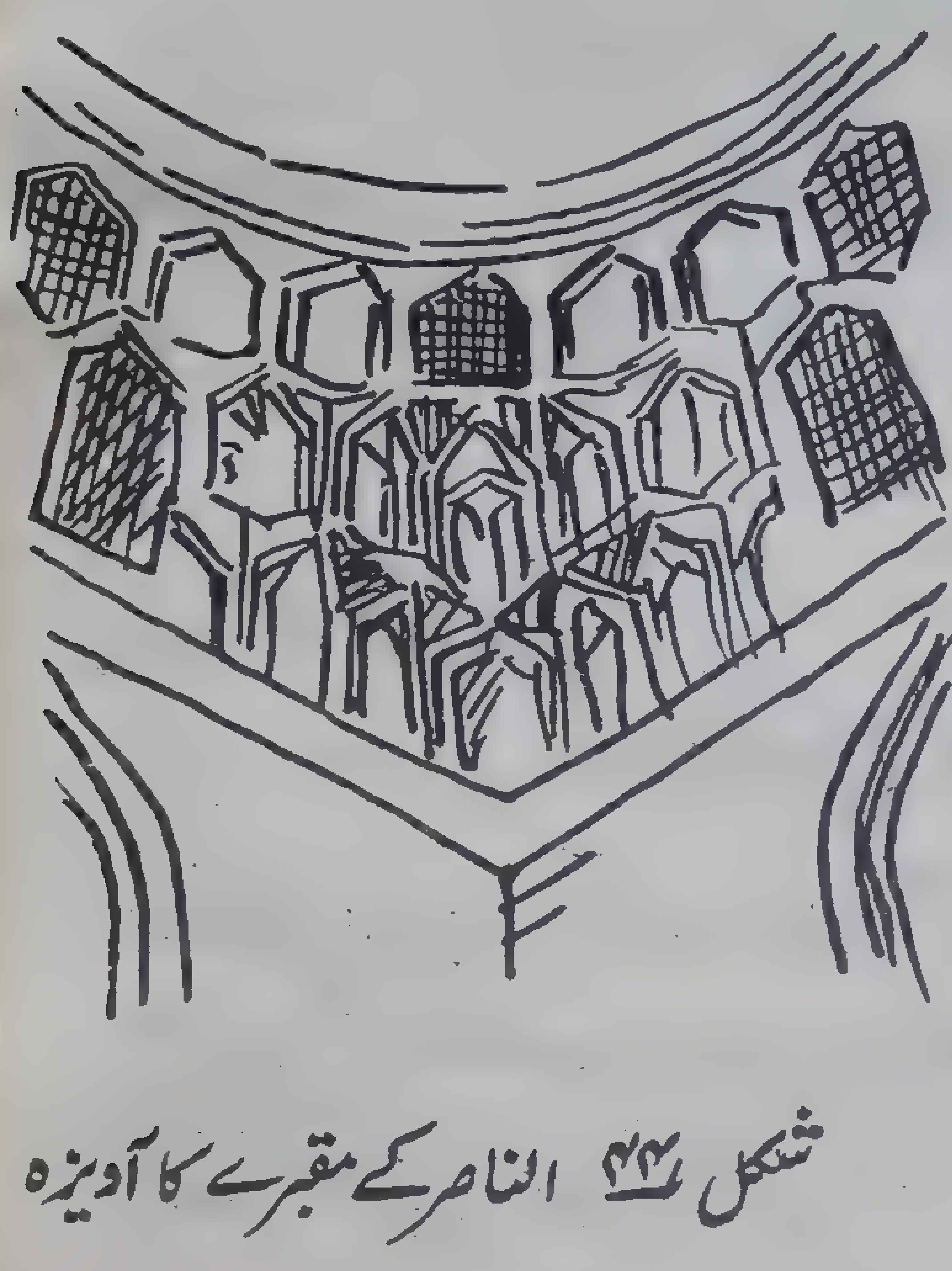
بنوایا۔[5] ان میں سے ہر ایک کے لئے ایوان مہیا کیا گیا تھا، لیکن ایوانوں کا نقشہ مدرسہ صالحیہ کے ایوانوں کے نقشے سے زیادہ ترقی یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ مدرسۂ ناصریہ میں ایوان ایک مشترکہ کھلے صحن کے چاروں بازوں کے اطراف بنائے گئے ہیں۔ مدرسۂ صالحیہ کی طرح ایوان کی ہر جوڑی کے لئے ایک صحن مہیا کرنے کی بہ نسبت یہ ترتیب کم خرچ ہے۔ لیکن اس تبدیلی نے طلبہ کے حجروں کو بے جگہ کر دیا ہے جو اس قسم کے نقشے میں صحن کے اطراف ایوانوں کے بنانے سے جو چلیپا بنتا ہے، ان کے زاویوں میں آسانی کے ساتھ بنائے جا سکتے تھے۔ اس مدرسے میں دو اور خصوصیتیں ایسی ہیں جو کسی قدر مخصوص دلچسپی کی حامل ہیں؛ ایک نفیس سنگستری محراب اور ایک گوتھک باب الداخلہ۔ اس سے کچھ سال پہلے مرمر اور پچی کاری میں بنی ہوئی مقبرہ قلاؤں کی محراب کے بعد سنگستر کی طرف یہ بازگشت ظاہر کرتی ہے کہ گچ اور مٹی کی مسوپٹیمیائی روایات میں ابھی تک جان باقی تھی، اور یہ اتنی مقبول تھیں کہ درجہ اول کی اہمیت رکھنے والی عماروتوں میں بھی ان کے لئے جگہ نکالی جا سکتی تھی۔ گوتھک دروازہ قاہرہ میں عکہ سے لایا گیا تھا۔

---

[5] مقریزی، ج ۲، ص ۲۸۲

جہاں وہ کینسا کے ایک حصّہ میں لگا ہوا تھا۔ مدرسہ ناصریہ الناصر کے مقبرہ سے ایک غلام گردش کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ الناصر کا مقبرہ ایک گنبد دار عمارت ہے جو مدرسہ کی محراب کی طرح مقامی اور دیرینہ خشتی اور سنگستری مکتب کا کام ہے۔ گنبد، محرابوں کے ایک مجموعہ پر اُٹھایا گیا ہے۔ یہ محرابیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ شجرۃ الدر اور سیدہ رقیہ کے مقبروں کی بیان شدہ محرابوں سے براہِ راست تعلق ظاہر کرتی ہیں۔ الناصر کے مقبرے میں (گذشتہ مقبروں کے برخلاف) دو کی بجائے تین قطاریں ہیں اور مثمنی عبور کو پوری طرح چھپا لیا گیا ہے (شکل ۴۴)۔

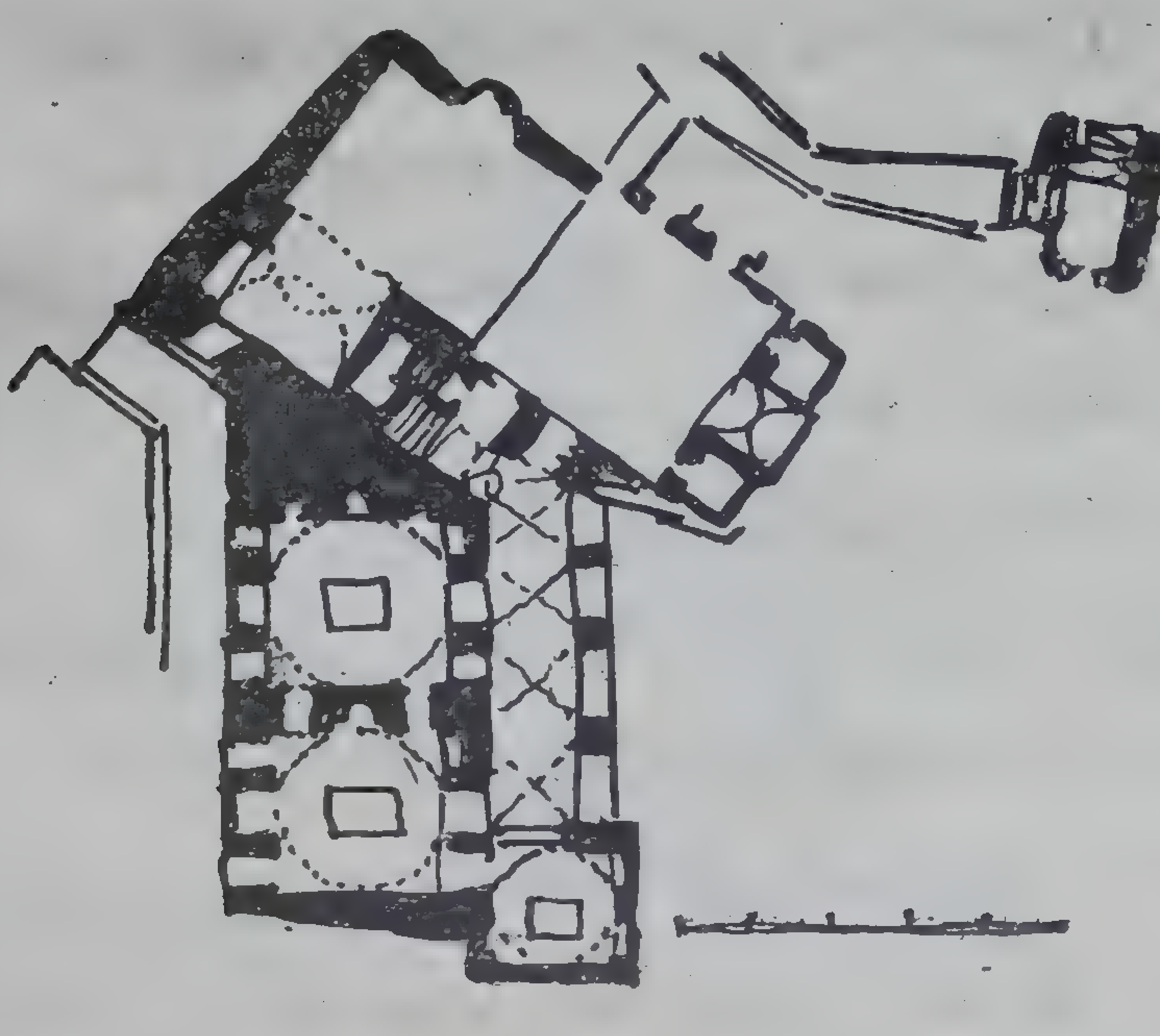
اس زمانے میں مصر کے مملوک حکمران نہ صرف زمین کی زرخیزی کی وجہ سے بلکہ مشرق و مغرب کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی اس پر ان کے اقتدار کی وجہ سے غیر معمولی طور پر دولت مند ہو گئے تھے۔ دولت مند امیروں نے جو نفیس اور مقدس عمارتیں بنوائیں



شکل ۴۴ الناصر کے مقبرے کا آویزہ

ان میں نفیس ترین ایک مدرسہ اور مقبرہ ہے جسے سنہ ۱۲۰۳ء میں امیر سالار اور امیر سنجر الجاولی نے بنوایا تھا یہ مقبرہ اور مدرسہ قاہرہ کے جنوب میں مسجد ابن طولون کے قریب ہی ایک پہاڑی کے اوپر بنائے گئے ہیں۔ محل وقوع کے مدنظر اس کا نقشہ غیر مربوط ہونا ضروری تھا (شکل ۴۵)۔ اس نقشہ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ اور تین گنبد دار مقبرے بنائے گئے ہیں۔ ان گنبدوں میں سے دو گنبد ایک دوسرے سے متصل سڑک کے رُخ پر اُٹھائے گئے ہیں۔ سب سے بڑے گنبد کے بازو مینار قائم کیا گیا ہے۔ فرشی سطح سڑک سے اونچی ہے اور دو زینے، ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی اس تک پہنچنے کے لئے درکار ہیں۔ اندرونی زینے کے سرے پر ایک جانب مدرسہ میں اور دوسری طرف مقبروں میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ بیرونی طور پر اصل پیش رُخ کی دیواریں گھڑے ہوئے پتھر کی ہیں۔ مینار (شکل ۴۶) صدر باب الداخلہ سے کسی قدر سیدھی جانب اوپر قائم کیا گیا ہے۔ یہ ایک اونچا مربع مینار ہے جو پتھر میں بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر اینٹ اور گچ میں بنا ہوا مثمنی دُھرا ہے۔ اسے قلمی آرائشوں کی قطاروں کے ذریعہ ایک چھوٹے سے استوانہ نما دھرے سے الگ کیا گیا ہے جس کے اوپر

قلمی آرائش اور اینٹ میں ایک گمرگی قبہ بنایا گیا ہے۔
گنبد پسلی دار ہیں، اور ان کی تعمیر میں محرابوں کے ذریعہ
سہارنے کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے
یہ اینٹ میں بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت میں کئی دلچسپ
چیزیں ہیں۔ گنبد کی مربع زیرین تعمیروں کا دائروں
میں عبور (اسی زمانے کے قریب بنے ہوئے مدرسہ
الناصر کی طرح) وسطی مثمنی تغیر کے بغیر بنایا گیا ہے۔ مینار کی
وضع پتھر میں بنے ہوئے مینار، مربع نقشے (ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ یہ مینار قلاؤں کی نقل ہے)، گچ اور اینٹ میں
بنی ہوئی دو بالائی منزلوں کا مجموعہ ہے جو اسی طرز میں
بنائی گئی ہیں جس کا رواج قلاؤں کے عہد سے پہلے تقریباً



شکل ۴۵ مقبرہ امیر سالار اور امیر سنجر جوبی کے مدرسہ کا نقشہ

بارھویں صدی سے ہو چلا تھا۔ اصل پیش رُخ سڑک سے
لے کر فرشی سطح تک ایک اونچی سادہ دیوار پر مشتمل ہے۔
اس سطح کے اوپر پایوں کے ذریعہ منقسم طاقوں میں دریچے
نکالے گئے ہیں۔ یہ وہی اصول ہے جسے مقبرۂ قلاؤں کے
معماروں نے قائم کیا تھا۔ لیکن یہاں محرابوں کے اوپر
مسجد قلاؤں کی طرح کمانیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ لیکن
یہاں پتھریں تین ایسے افقی توڑے دار چنائی کے دور
ہیں جن کی تزئین قلمی آرائش سے کی گئی ہے اور انھیں
طاقوں کے اوپر کی دیواروں کے درمیانی پایوں کے
ہم سطح کر دیا گیا ہے۔ قلمی آرائش سے نیچے ایک چنائی
کے دور کے فاصلے پر دو چنائی کے دوروں کے برابر
عمیق ایک مسلسل کتبہ پورے پیش رُخ پر پھیلا ہوا چلا
گیا ہے۔ دریچوں کے افقی سرولوں کے اوپر خسی ڈاٹیں
بنائی گئی ہیں۔ اس مسجد میں ہم اب بھی دو مختلف رجحانات
اور روایتوں کا مضطرب سا امتزاج دیکھتے ہیں۔ یعنی
سنگی تعمیر کاروں اور خشتی تعمیر کاروں کی روایات اور
مزاجوں کا امتزاج، گنبد اور ان کے آویزے، اور
مینار کی بالائی منزلیں اب بھی خشتی ہیں۔ مینار کی تعمیر
میں ایک اور پشت گذر جانے تک اینٹ کا استعمال
ترک نہیں ہوا تھا۔ امیر قسوں کے مقبرے اور خانقاہ
کے لئے سنہ ۱۳۳۵ء میں جو مینار تعمیر ہوا وہ تمام تر پتھر

میں بنایا گیا۔ ترتیب اور مینار کی مربع، مثمن اور گول منزلوں اور کمر کی وضع کے قبہ کے لحاظ سے مینار قسوں مینار سنجر جوبی سے مشابہ ہے۔ لیکن اس کی تمام خشتی خصوصیات تفصیل میں قدرے تغیر کے ساتھ پتھر میں بنائی گئی ہیں۔ اس تاریخ کے بعد ہی ایرانی اصل کا عجیب سا کمر کی وضع کا قبہ ترک کر دیا گیا، اوراس کی جگہ مشہور و معروف اجبلہ نما حد بندی نے لے لی جو تنگ قطر کی مڑی ہوئی گردن پر اُٹھائی جاتی ہے۔ اس وضع کا اوّلین یا اوّلین میناروں میں سے ایک مینار زاویہ الامیر پہلوان کا مینار ہے جو سنہ ۱۳۴۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس مینار کی بالائی منزل کی مخدوش حالت کی وجہ سے اجبلہ نما حد بندی کو گرا دیا گیا ہے، لیکن مینار کا جو کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے وہ پتھر میں مثمنی اور استوانی شکلوں کو بہت اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔

الناصر نے سنہ ۱۳۴۱ء میں انتقال کیا۔ وہ ایک بہت بڑا معمار اور غیر معمولی شخصیت کا حامل حکمران تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بعض وقت ایک دن میں تعمیرات پر تین سو دینار صرف کئے ہیں۔ فنون لطیفہ اور صنائع کو غالباً اس کے عہد سے زیادہ کبھی عروج اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ وہ گھوڑوں اور بھیڑوں کی پرورش کا بڑا شوقین تھا، شکار

کا شیدائی اور جواہرات کے جمع کرنے کا ذوق رکھتا تھا۔ وہ ایک بالکل مطلق العنان بادشاہ تھا۔ حالانکہ جسمانی حیثیت سے وہ بہت حقیر تھا، اس کے ایک پاؤں میں لنگ اور ایک آنکھ میں موتیا بند تھا۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے حسین کے نام کے ساتھ فنِ تعمیر کا ایک زبردست کارنامہ منسوب ہے۔

سلطان حسین کا مشہور مدرسہ اور مقبرہ سنہ ۱۳۵۶ء میں بننا شروع ہوا اور سنہ ۱۳۶۳ء میں مکمل ہوا۔ پوری عمارت دو ایکڑ سے زیادہ رقبۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ مصر میں سب سے بڑا مدرسہ یا مکتبی مسجد ہے۔ یہ سُنّی فرقے کے چاروں مکاتیب عقائد کی تعلیم کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں چار ایوان وسطی کھلے صحن کے اطراف ترتیب دئے گئے ہیں (شکل ۴۸) جس کے بیچ میں وضو کے لئے حوض بنا ہوا ہے۔ صدر ایوان کے پیچھے مقبرہ ہے صحن کے اطراف ایوان بنانے سے نتیجتاً جو چلیپہ نما نقشہ بنتا ہے اس کے زاویوں میں طلباء کے حجروں کے سوا ہر زاویہ میں ایک ذیلی صحن اور اس کے مقابل ایک ایوان ہے۔ نوک دار قوسی لداؤ چھتیں چاروں ایوانوں پر ڈالی گئی ہیں۔ مقبرہ کا نقشہ مربع ہے، اور اس پر ایک گنبد ہے۔ یہ اصلی گنبد نہیں ہے۔ اصلی

---

۵ اسٹینلی لین پول۔ محولۂ صدر کتاب

گنبد سنہ ۱۵۱۷ء میں ترکی سلطان سلیم کی گولہ باری کا شکار ہو گیا اورکسی نامعلوم تاریخ میں گر پڑا۔ لیکن یہ سنہ ۱۶۱۶ء تک بھی قائم تھا، اس سنہ میں ایک سیّاح پٹرو ڈیلا ویلے (PETRO DELLA VALLE) نے اسے دیکھا اور اس کا حال بیان کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "گنبد پتلا سا شروع ہوتا ہے، پھر پھول گیا ہے، اور پھر انڈے کی طرح سکڑ گیا ہے۔" یہ تفصیل اس شکل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ایران اور ترکستان میں بعض گنبدوں نے اختیار کی ہے۔ یہ گنبد غالباً ایک چوبی آویزے پر اینٹ میں بنایا گیا تھا۔ موجودہ گنبد مربع کے زاویوں میں لگے ہوئے وزنی چوبی شہتیروں کے اوپر بنایا گیا ہے۔ اور اس کے گرد قلمی آرائش کے کروی حصّوں سے مشابہ ایک مہین سا چوبی کام کیا ہوا ہے۔ المقریزی کی ایک عبارت سے اور خود نقشہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل میں چار مینار بنانے کا ارادہ تھا۔ دو مینار پتھر کے زبردست سہاروں پر صدر باب الداخلہ کے دونوں جانب اور باقی دو جنوب مشرقی دیوار کے گوشوں پر۔ صدر باب الداخلہ پر میناروں کی جو جوڑی بننے والی تھی اس میں سے ایک مینار مکمل ہونے سے پہلے ہی گر گیا اور دوبارہ تعمیر نہیں کیا گیا۔ دوسری



شکل ۴۸ مدرسہ سلطان حسین کے ایوانوں کی ترتیب

جوڑی سرے سے شروع ہی نہیں کی گئی۔ گرے ہوئے مینار کے بارے میں المقریزی لکھتا ہے "اس لئے سلطان نے یہ مینار اور اس کے جواب میں ایک مینار بنانے کا خیال ترک کر دیا"

باب الداخلہ کی پھاٹک پر جوڑی کے مینار بنانے کی ایسی ہی ترتیب ایشیائے کوچک کے شہر سیواس (Siwas) کے مدرسہ جیوک میں مسجد سلطان حسین کی

تعمیر سے کوئی ستّر سال پہلے سنہ ۱۲۷۰ء میں اختیار کی گئی تھی۔ اور بہت سی حقیقتوں کی طرح یہ حقیقت بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اب مسوپٹیمیا یا ایرانی ——— دوسرے الفاظ میں ایشیائی ——— اثرات سب سے زیادہ قوی نہیں رہے تھے۔ بلکہ اب بحر روم کے شمال مشرقی گوشے کے ساحل پر واقع سنگی تعمیر کے ملکوں کے اثرات سب سے زیادہ قوی ہو گئے تھے۔ المقریزی کا بیان ہے کہ سلطان حسین اپنے عظیم الشان مدرسے کے نقشے کو "بہت وسیع ابعاد پر بنانا اور مسجد کو سب سے زیادہ حسین وضع اور ٹھوس متناسب کے ساتھ تعمیر کرنا چاہتا تھا" اس کا بیان ہے کہ "دنیا کے تمام اسلامی ملکوں میں کوئی عبادت گاہ ایسی نہیں ہے جو اس مسجد کا مقابلہ کر سکے. اس کی تعمیر ایک دن کے وقفہ کے بغیر تین سال تک برابر جاری رہی اور اس پر ہر روز بیس ہزار درہم صرف ہوتے تھے۔" نیز اس کا بیان ہے کہ حاجب مقبل نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ اس نے سلطان کو یہ کہتے سنا کہ "بڑے ایوان کی کمان قائم کرنے کے لئے ایک لاکھ درہم صرف ہوئے۔ اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہتے کہ ایک سلطان مصر اپنی ایک عمارت کی تکمیل سے قاصر رہا تو میں اس بے حساب صرفے کی وجہ سے مسجد کی تعمیر کا خیال ترک کر دیتا۔" المقریزی نے اس مسجد

ان میں اس کے ایوان کی وسعت بھی ہے - اور کہتا ہے کہ یہ عراق کے شہر مدائن (تیسفون) کے ایوان کسرا سے بھی زیادہ بڑا ہے - نیز اس کا عریض گنبد جس کا مثل مصر، شام، عراق یا یمن میں اس سے پہلے نہ دیکھا گیا۔ اور اس کا مرمریں ممبر اور اس کا زبردست داخلہ کا پھاٹک - بلندی حاصل کرنے کی مسلسل کوشش (جس کا ذکر ہو چکا ہے) جو دمشق، قاہرہ قیروان، اور قرطبہ کی تمام بڑی مسجدوں میں بالکل واضح ہے، مسجد سلطان حسین میں گذشتہ عمارتوں کی بہ نسبت زیادہ کامیاب نظر آتی ہے - یہ کامیابی حسب ذیل حالات کے یکجا جمع ہو جانے کا نتیجہ ہے؛ سلطان کا عزم بلند۔ صرف کرنے کے لئے اس کے پاس غیر معمولی دولت، انتہائی ماہر سنگ راجوں کی شان دار جماعت جسے زمانے کے انقلاب نے مملوک سلطنت کی خدمت میں منسلک کر دیا تھا۔ اور آخر میں اس قسم کے نقشے کا ارتقا جس کا سب سے بڑا محرک شیعہ سُنّی جھگڑا تھا۔ صدر ایوان (۸۶) فیٹ بلند ہے۔ داخلہ کا پھاٹک فرش کی سطح سے لے کر گھڑ کھچول کے سرے تک (۲۷۰) فیٹ ہے اور اصلی مینار بھی اس سے کچھ کم نہ ہو گا۔ اس عظیم الشان عمارت کی وضع ترکیب میں کئی عناصر شامل ہیں۔ ان میں سے بعض عناصر اس سے پہلے قاہرہ میں ظہور پذیر ہو چکے تھے اور بعض

نئے تھے۔ نقشہ کا یہ مرکزی اصول کہ چار ایوانوں کو (ہر ایوان ایک سنی مکتب خیال کے لئے) ایک وسطی صحن کے اطراف بنایا جائے، مسلمہ اصول بن چکا تھا۔ صدر ایوان کے پیچھے مقبرہ کا محل وقوع اور باب الداخلہ کا محل وقوع غالباً جگہ اور مقام کی شکل اور نوعیت سے پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہے۔ داخلہ کا دروازہ ایک گہرے طاق کے اندر بنایا گیا ہے۔ اس طاق کے دونوں بازوؤں پر پتھر کی تعمیر ہے۔(شکل ۴۹) جو آگے بڑھ کر عمارت کے اصل پیش رُخ سے مل گئی ہے۔ یہ ترتیب پہلی مرتبہ اس وقت اختیار کی گئی جب کہ شمالی اثرات مصر میں پہلی سنگ بستہ مسجد جامع الحاکم میں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ ترتیب مسجد اقمار، جامع بیبرس، اور کسی قدر کم نمایاں حیثیت سے مدرسہ اور مقبرہ قلاؤں اور مدرسہ سنجر جولی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح سلطان حسین کے عہد تک طاقی دروازہ مسجد کی وضع ترکیب کا ایک مسلمہ اور عام طور پر مستعملہ اصول بن گیا تھا۔ جامع الحاکم میں طاق ایک قوسی لداؤ چھت کے ذریعہ پاٹی گئی ہے۔ مسجد اقمار اور مدرسہ قلاؤں کی نسبتاً اتھل طاقیں ایک کمان کے ذریعہ بند کی گئی ہیں اور مدرسہ سنجر جولی میں اس مقصد کے لئے اینٹ کی چنائی کے توڑے دار تین دور استعمال کئے گئے ہیں۔ ان

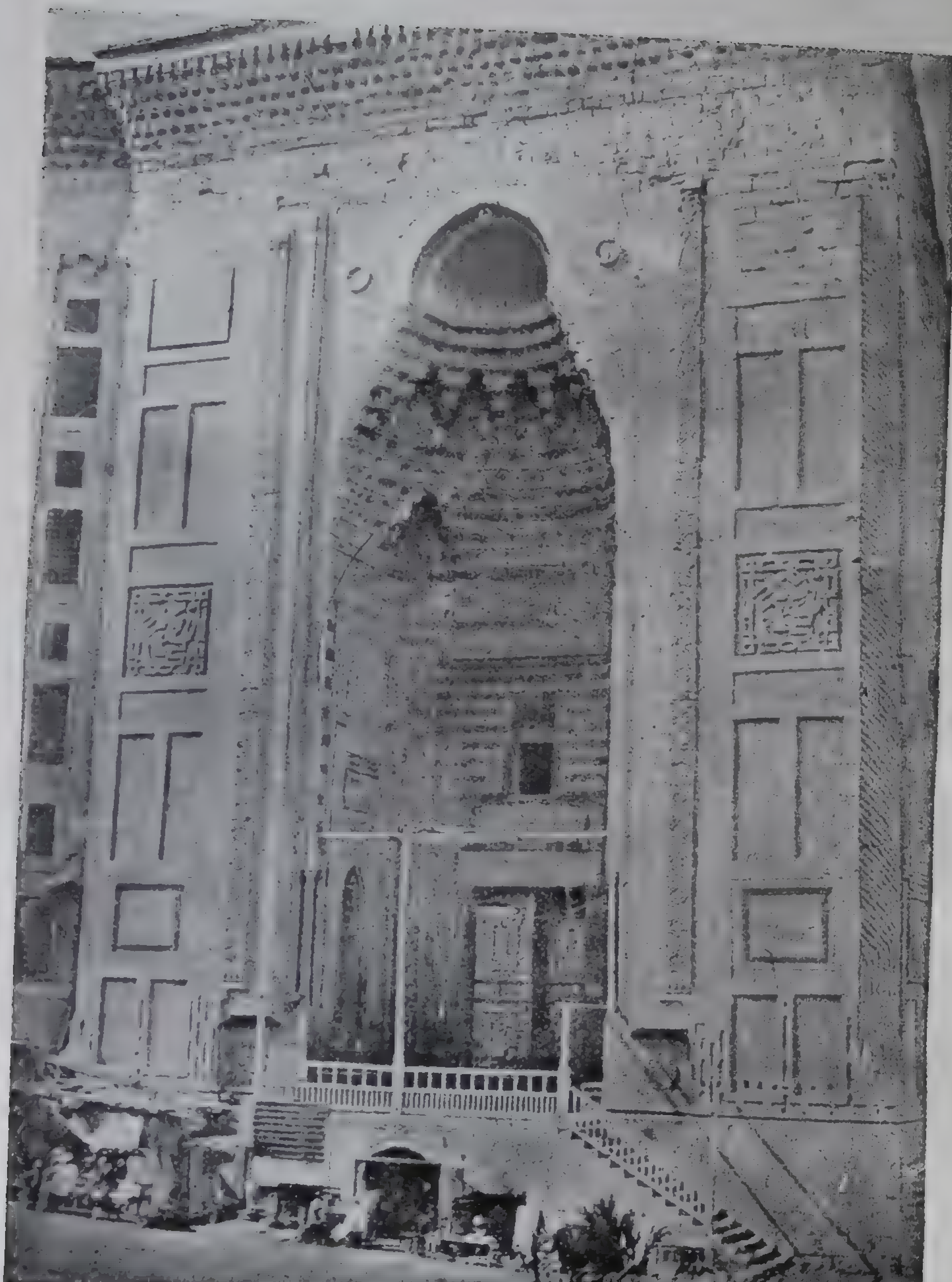
کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہری طاق جس کے اندر مدرسہ سلطان حسین کا دروازہ بنایا گیا ہے، توڑے اور کمان کے امتزاج سے پاٹا گیا ہے۔ پتھر کی چنائی کے توڑے دار دور قلمی آرائش سے مزین کئے گئے ہیں۔ طاق کا عمق اتنا زیادہ ہے کہ ایک دو نہیں بلکہ بارہ دور نہایت خوبی سے ایک قوس پر اس طرح بنائے گئے ہیں کہ اندرونی زاویوں میں محرابیں بن سکیں، اور اس کے سرے پر ایک کمان دار کمر کی محرابی سر ہے۔ طاق کے اوپر قلمی آرائش سے مزین پتھر کی توڑے دار چنائی کا استعمال مصر کی ایجاد نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی یہ طرز اس ملک میں اس وقت دکھائی دیتی ہے جب کہ بیبرس اور قلاؤں کی فتوحات شام پر کئی برس نہ گذر گئے۔ قاہرہ میں اس کی قدیم ترین باقی ماندہ مثال سنہ ۱۲۹۸ء کی ہے اور جامع زین الدین یوسف میں پائی جاتی ہے۔ جامع سلطان حسین میں پھاٹک کے سرے کی جو وضع استعمال کی گئی ہے اس کا ایک ابتدائی نمونہ لیکن چھوٹے پیمانے پر جامع احمد المہمندار (شکل ۵۰) کے باب الداخلہ کے اوپر پایا جاتا ہے جو سنہ ۱۳۲۴ء کا بنا ہوا ہے، ایک اور ابتدائی نمونہ بڑے پیمانے پر اور کوئی دو تین سال بعد کا باب القطنین پر پایا جاتا ہے۔ جو بیت المقدس کی

جامع مسجد کے متعدد دروازوں میں سے ایک ہے۔ ان نمونوں سے محتاط طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ وضع ترکیب مملوک سلطنت کے سنگی تعمیر کے نئے مخصوص ملکوں کے صناعوں کی پیداوار ہے۔ یہاں سے یہ شام میں بیبرس اور قلاؤں کی ان فتوحات کے بعد سے مصر میں مروج ہوئی جس نے ان دونوں علاقوں کو متحد کر دیا۔ اس قسم کے پھاٹک کے سرے کی ایک اور ابتدائی مثال امیر پشبک[ع] کے قصر کے باب الداخلہ پر پائی جاتی ہے۔ یہ قصر غالباً مدرسہ سلطان حسین سے بیس سال پہلے تعمیر ہوا ہے۔

مسجد احمد المہندر، قصر امیر پشبک اور مدرسہ سلطان حسین کے باب الداخلہ کے پھاٹک کے سروں میں ایک خوش وضع گگر نمایاں طور پر محرابی سر کی کمان کی حد بندی کرتی ہے۔ یہ توڑے دار چنائی کے دوروں کے اوپر بنائی گئی ہے اور سایہ کے زیر اثر اس دیوار کی سطح سے محراب کو ممتاز کرتی ہے جس کے اندر یہ بنائی گئی ہے۔ محرابی کمان کی ڈاٹوں کے نیچے نہ تو احمد المہندر کی

ے دیکھئے، کیپٹن اے، کے، سی کرسول کی کتاب "مصر کی اسلامی یادگاروں کی ایک مختصر فہرست"

ع A BRIEF CHRONOLOGY OF MOHAMMADAN MONUMENTS OF EGYPT. P.P. 98–100.



شکل نمبر ۴۹- جامع سلطان حسین کا باب الداخلہ



شکل نمبر ۵۰ مسجد احمد المہمندر کا باب الداخلہ

مسجد ہیں اور نہ امیر پشبک کے قصر ہیں حاشیہ ہیں اور نہ مسلسل کٹے ہوئے کنگرہ ہیں سطح دیوار سے قلمی آرائش کو علیحدہ کرنے والا کوئی واضح خط پایا جاتا ہے۔ نتیجتہً اس کا اثر کچھ دھندلا سا ہے۔ سلطان حسین کی پھاٹک ہیں نمایاں حد بندی کی کوشش کی گئی ہے۔ محرابی کمانوں کی پشت محرابوں کے اوپر پتھروں کا ایک تنگ حلقہ کمان کے ہم سطح اور نیچے تک لایا گیا ہے تاکہ قلمی آرائشوں اور محراب کو شامل کرتے ہوئے، چوکھٹا بن جائے اور اس طرح پورے مجموعہ کے لئے ایک خاکہ بنے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو غالباً یہ محسوس ہوگا کہ چوکھٹے کی یہ چنائی دوسرے پتھروں کی بہ نسبت گہرے رنگ کے پتھر کی ہے۔ اس ہیں شک نہیں کہ اس چنائی کے دور کو اور بھی واضح کرنا ممکن تھا۔ لیکن ایسا کرنے سے غار نما شکوہ کا اثر کم ہو جاتا جس کے پیدا کرنے ہیں تعمیر کار کامیاب رہا ہے۔

تعمیر کاری ہیں عام طور پر بلکہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ خود تعمیر سے متعلق ہر خصوصیت کی عملی صورت کا ماخذ اور اس کی تزئین سے متعلق ہر چیز جادو ٹونے اور مذہبی روایتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس ماخذ کا پتہ چلانا ہر جگہ آسان اور ممکن نہیں۔ اور عملی یا جادو ٹونے کی بنیادوں پر ہر ثبوت کو حق بجانب بھی قرار

نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن تعمیر سے متعلق نت نئی بناوٹوں کا بعض وقت گذشتہ ایسے زمانوں میں پتہ چلانا ممکن ہے جب کہ (ہو سکتا ہے کہ وہ) کسی اور مسالے میں اور ممکن ہے کسی دور قدیم زمانے میں عملی کام انجام دیتے تھے۔ کچھ اسی قسم کی خصوصیت مدور یا نالی دار شکل ہے جو اس قدر عام طور پر اسلامی تعمیر کاری میں زاویہ قائمہ کی بجائے گوشوں میں پائی جاتی ہے۔ اس شکل سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ (اگرچہ اس خیال کی صحت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قطعی ثبوت کے لئے ضروری شواہد کا طویل سلسلہ حوادث ایام یا انسانی بغض و عناد کے ہاتھوں غارت ہو گیا ہے) یہ تعمیر کا وہ طریقہ ہے جس کی اصل اور اس کا بر محل ہونا دھوپ میں خشک کی ہوئی اینٹوں کے استعمال پر مبنی ہے۔ کیونکہ یہ ایک پھوٹک مسالہ ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچنے والے مقاموں پر اُبھرے ہوئے زاویے بنانے کے لئے بالکل ناموزوں ہے۔ اس کے سوا یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں بھی اسلامی تعمیر کاری میں دھوپ میں خشک کی ہوئی (کچی) اینٹیں استعمال کی گئی ہیں مدور شکل بھی استعمال کی گئی ہے۔ دجلہ کے کنارے سامرہ کی عمارتیں اس کی ایک مثال ہے جب کبھی پکی اینٹیں کچی اینٹوں کی جگہ لے لیتی ہیں تو مدور

شکل ترک کر دی جاتی ہے یا اختیار کی جاتی ہے تو خوش نمائی اور زیبائش کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ اسی لئے یہ شکل اس وقت بھی اختیار کی جاتی ہے جب کہ اینٹ کو روغنی سطح کے ذریعہ اور پختہ کیا جاتا ہے جیسے مثال کے طور پر ایران اور ترکستان کے ایرانی دبستان میں ہوتا ہے۔ پتھر اور مرمر کے عمارت ساز جب دلکش شکلوں سے دو چار ہوتے ہیں تو وہ ان شکلوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ انھیں وہ چوبی تعمیر سے بھی لیتے ہیں اور اینٹوں کی عمارت سے بھی۔ ان شکلوں کو وہ مختلف ذریعوں سے لے کر انھیں اپنے مسالے میں پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی سنگی تعمیر کاری جیسی کہ ایشیائے کوچک، شام اور مصر میں مروج ہے اسی طریقہ کار کی مرہون منت ہے۔ مدرسۂ سلطان حسین کے شاندار پھاٹک (شکل ۴۹) کے مدور بیرونی زاویے اس کی ایک مثال ہیں۔ ایسے مدور زاویے سنگی تعمیر کاری میں پہلی دفعہ کس زمانے سے ملتے ہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ اور نہ ہی اس کی اولین نمونوں کو مصر میں تلاش کرنا چاہیئے بلکہ ان کو شمالی مسوپٹیمیا کی ان سرحدوں پر تلاش کرنا چاہیئے جو پتھر کے ملکوں اور اینٹ کے ملکوں کو جدا کرتے ہیں۔ مدور گوشے سے لے کر دیوار میں لگے ہوئے دھرے کا خیال اور دیوار میں لگے ہوئے

دھرے سے لے کر گوشے کے آزاد ستون کی ایجاد ـــــ اور یہ دونوں بالکل ابتدائی زمانے سے اسلامی تعمیر کاری کی خصوصیات رہی ہیں ـــــ کوئی ایسا طویل ارتقائی قدم نہیں۔ پہلے تو یہ اینٹ میں اینٹ کے پایوں کے گوشے میں لگے ہوئے دھروں کی صورت میں نمودار ہوئے جیسے کہ مسوپٹیمیا میں رقہ کی مسجد میں اور مصر میں ابن طولون کی مسجد میں پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ داخلے کے طاقوں کے گوشوں میں لگے ہوئے پتھر یا مرمر کے انفرادی دھروں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ مدرسۂ سلطان حسین کے شاندار پھاٹک میں لگائے گئے ہیں یا پھر جہاں کہیں ان کا لگانا موزوں معلوم ہو جیسے کمان یا مینار کے دریچوں کے پہلوؤں میں۔ ایسی خصوصیات مصر میں مملوک سلطنت کے شمال سے اناطولیہ سے، یا شام سے لائی گئی تھیں۔ حد درجہ منبت کار زیباکشی عمودی تختیاں، گتھے ہوئے نقشوں کے مربع دتے، کمان شانوں میں مدور لوحین، یہ تمام نمایاں خصوصیات جو مدرسہ سلطان حسین کے شاندار باب الداخلہ میں پائی جاتی ہیں، شمال ہی سے لائی گئی تھیں۔ اس عہد تک کے قاہرہ کے لئے یہ چیزیں نئی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ تمام چیزیں ایشیائے کوچک کے شہر قونیہ میں پائی جاتی تھیں۔ مقبرے کے بڑے مدور دریچوں کے اطراف متقاطع دائروں کی آرائش (شکل ۱۵)، سپاٹ



شکل نمبر ۱۵- مقبرہ سلطان حسین کا ایک منظر

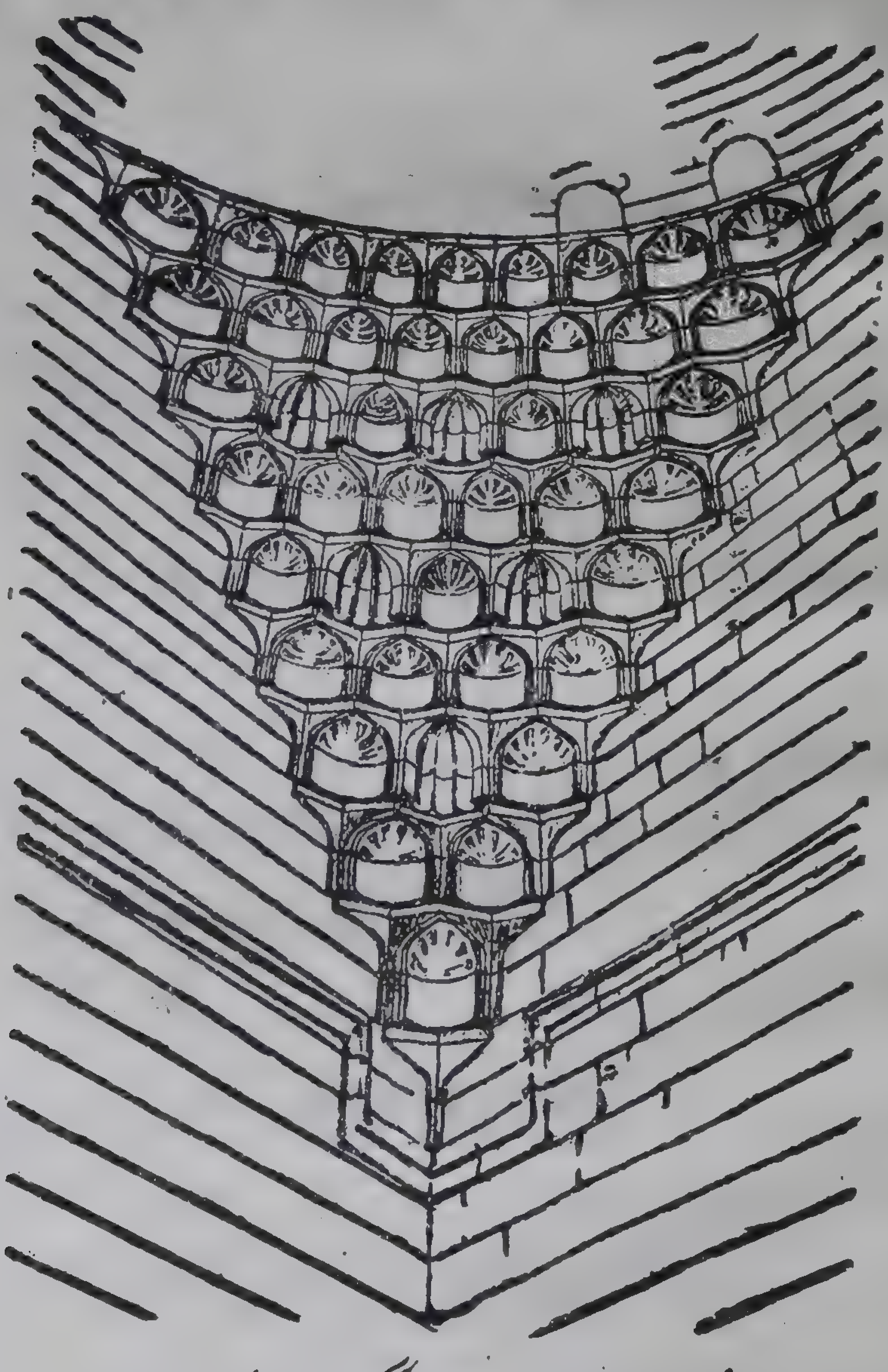
طاقوں کے سروں کی ترتیب بھی، جن کے اندر مقبرے کے
دہرے دریچے بٹھائے گئے ہیں، شمال سے لی ہوئی ایک
نئی چیز ہے۔ دہرے روشن دان اور ان کے اوپر ایک
مدور روشن دان کی ترتیب جو پہلی مرتبہ قلاؤں کے مقبرے
میں نمودار ہوئی، نصرانی فن تعمیر سے تماس کا نتیجہ ہے،
اور یہ ترتیب اب اسلامی فن تعمیر کا نہایت اہم عنصر
بن گئی ہے۔ مدرسہ میں اور بھی چیزیں ہیں جو نصرانی
فن تعمیر کے حسن کے قوی اثرات کی شاہد ہیں۔ مثال
کے طور پر محراب کے پہلوؤں میں لگے ہوئے سرستون اور
کرسیاں نصرانی کام ہے، اور شاندار باب الداخلہ کے
ایک جانب ایک چھوٹا سا پتھر کا دھرا ہے جسے گوتھک
وضع کے دلتوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا
ہے گویا یہ قبتہ الصخرہ (صلیبی محاربوں کے نزدیک یہ
مقام مقدس (TEI IYLUM DOMINI) سمجھا جاتا ہے) اور گوتھک
کلیسا کا نمونہ ہے۔ صدر ایوان کی دیوار قبلہ اور اسی طرح
محراب کا اجارہ مرمریں دلتوں سے مزین کیا گیا ہے۔
اس کے اوپر ایک نفیس کتبہ ہے جو گچ میں کاٹا گیا ہے۔

اگرچہ مدرسۂ سلطان حسین کا اصلی گنبد بے شبہہ خشتی
تھا، لیکن چودھویں صدی کے وسط سے پہلے سنگی گنبد
ایک مختصر پیمانے پر قاہرہ میں نمودار ہو چکے تھے۔ اس
تاریخ کے بعد سے یہ اور عام ہونے لگے اور آخر کار

انھوں نے تمام اہم عمارتوں میں خشتی گنبدوں کی جگہ لے لی۔ خشتی گنبد کو ترک کر کے سنگی گنبد کو اختیار کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سنگی عبوری رُخ نے خشتی عبوری رُخ کی جگہ لے لی اور خشتی طاقوں کا وہ نظام غائب ہو گیا جس کا کچھ حال بیان ہو چکا ہے۔ سنگی عبوری رُخ کو مسلمان سنگ تراش اسی طرح تیار کرتے تھے جس طرح وہ کسی شان دار پھاٹک کے طاق سے لے کر اس کے اوپر کی دیوار کی مسطح سطح تک عبور بناتے تھے۔ یعنی وہ پتھر میں توڑے دار دوروں کے نظام اور توڑیدار پتھروں کے سروں پر قلمی آرائش بنایا کرتے تھے۔ شکل ۵۲ میں اس طریقہ کی وضاحت کی گئی ہے اور اس میں وہ سنگی توڑے دکھائے گئے ہیں جو سنہ ۱۴۲۰ء کے تعمیر شدہ مقبرۂ سلطان الملک المؤید کے مقبرے میں مربع زیرین عمارت کے مدور گنبد کے طریقہ عبور میں استعمال کئے گئے ہیں۔ پندرھویں صدی میں صدفی گنبد جہاں تک ہو سکے ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔ یہ گویا سنگی ہیں، اور بعض اوقات اتنے پتلے ہیں کہ ان کا عمق آٹھ انچ سے زیادہ نہیں ہے۔ پتھروں کو آپس میں لوہے کی سلاخوں کے ذریعہ جوڑا جاتا تھا۔

بحری مملوکوں کا خاندان جن کے بیشتر سلاطین ترک تھے سنہ ۱۳۸۲ء کے قریب ختم ہو گیا اور ان کی جگہ

برجی مملوکوں نے لے لی۔ اس خاندان کے بیشتر سلاطین چرکسی تھے۔ بحری مملوکوں کے عہد کے خاتمے کے قریب مسجدیں اور مدرسے چھوٹے بننے لگے۔ اور سلطان حسین کے عظیم الشان مدرسہ کی تکمیل کے دس سال بعد سنہ ۱۳۷۲ء



شکل ۵۲ مقبرۂ المؤید کے گنبد کا طریقۂ عبور

میں مسجد یا مدرسے (یہ اصطلاحیں بدلتی رہی ہیں) کی وہ اولین مثال (امیر الفائزُ الیوسفی کا مدرسہ اور مسجد) ظہور پذیر ہوتی ہے جو آنے والی صدی میں چرکسی مملوکوں کے تحت عام ہونے والی تھی۔ اس طرز میں قدیم طرز میں جتنی گنجائش ہوتی تھی اس کے سوا ایک سبیل یا پانی پینے کے حوض اور ایک کُتّاب یا ابتدائی مدرسہ بھی شامل کر لیا گیا۔ سبیل کے لفظی معنیٰ راستے یا طریق کے ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر مفاد عامہ کی عمارتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے[۵]۔ یہ لفظ ایسی عمارتوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو وقف ہوتی ہیں۔ مشرق میں پانی نایاب ہے، اور پانی پلانا ایک کارِ خیر سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح اگرچہ لفظ "سبیل" ہر وقف یا خیراتی عمارات کے معنیٰ دیتا ہے، لیکن خاص طور پر یہ لفظ پانی پینے کے حوض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عموماً سبیل کسی گوشے میں، مسجد یا مدرسہ یا خانقاہ کے ایک ضمیمہ کے طور پر بنائی جاتی ہے۔ اس کے اطراف کانسی کا جنگلہ ہوتا ہے، اس کے پیچھے ناند یا حوض ہوتا ہے۔ پیالے

۵۔ ڈکشنری آف اسلام میں فن تعمیر پر فان برچم کا مقالہ "ARCHICHECTURE," VON BERCHEM IN "DICTIONRY OF ISLAM".

کو جنگلے سے گذار کر اس ناند یا حوض سے پانی لیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی مدرسہ یا کُتّاب میں عام طور پر سبیل کے اوپر چھت ہوتا ہے، اس کے آگے چھتے دار روکار ہوتا ہے، اور اس کے اوپر بعض اوقات بچوں کو دھوپ سے بچانے کے لئے نہایت چوڑا مخمسی چھت ہوتا ہے۔

سنہ ۱۳۸۶ء میں پہلے چرکسی یا برجی خاندان کے حکمران سلطان برقوق کے تعمیر کردہ عظیم الشان مدرسے میں صدر ایوان پر روایتی قوسی لداؤ چھت کی جگہ سپاٹ چوبی چھت کی اولین مثال ملتی ہے۔ یہ تبدیلی اخراج یا انجذاب کے تدریجی طریق عمل اور دوسرے مسالے میں تعمیر میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، اور اس میں ایرانی رشتے کی تعمیری اور تزئینی خصوصیات روز افزوں موضوع بنتے لگیں۔ قوسی لداؤ چھت کا ایوان ابتداً اور ایک عرصہ دراز تک مدرسہ کا واحد نشان امتیاز تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ خود ہی مقام درس تھا۔ لداؤ چھت کی جگہ سپاٹ چھت کا بدل صرف جمالیاتی ذوق یا خالص معاشی حالات کی پیداوار نہ تھا۔ یہ اس سے بھی آگے کی چیز تھی۔ یہ ایک علامت تھی اور یہ نتیجہ تھا اس تبدیلی کا جو مدرسہ کے مقصد اور اس کے نتیجے کے طور پر اس کے نقشے میں وقوع پذیر ہو

۱- جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور شیعی فرقوں کے
نا ـــــ ان شیعی فرقوں کے عقائد کا مقابلہ کرنے
ے لئے مدرسہ کو تیار کیا گیا تھا ـــــ وسیع تعلیمی پروپگنڈے
کی ضرورت کم سے کم ہوتی گئی، مدرسہ پہلے تو مقام درس
کی حیثیت سے اپنی خصوصیات کھونے لگا، اور پھر عبادت
گاہ کی صورت اختیار کرنے لگا، اور آخر میں بالکل اسی
مقصد کے لئے وقف ہوکر رہ گیا۔ کوئی جگہ یا کوئی رقبہ
جو عریض سے زیادہ عمیق ہو نماز کے لئے اتنا موزوں
نہیں جتنا کہ اپنے عمق سے زیادہ عریض رقبہ یا جگہ
اس کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ کیونکہ مسلمان قطاریں
صف بستہ ہوکر نماز ادا کرتے ہیں۔ ابتدا میں مدرسہ
کے صدر ایوان کا عمق اس کے عرض سے زیادہ ہوتا
تھا۔ سنہ ۱۴۳۰ء کی بنی ہوئی مسجد الآلہ (شکل ۵۳ء) کے
صدر ایوان کا عرض بازو کی دیواروں میں گہری اور
چوڑی طاقیں بنا کر بڑھایا گیا ہے۔ ان طاقوں کی وجہ
سے ایوان کا عرض اس کے عمق سے خاصا بڑھ گیا ہے۔
صدر ایوان کی ایسی ہی عرضی توسیع بالکل ایسے ہی
اسباب کی بنا پر بہت ہی ابتدائی عہد میں سنہ ۱۳۰۶ء
-سنہ ۱۳۰۹ء کی بنی ہوئی خانقاہ مظفر بیبرس میں پائی
جاتی ہے۔ خانقاہ ایک ایسا مقام ہے جہاں صوفی
تعلیمات کو اختیار کرنے والے لوگ زہد و عبادت



شکل ۵۲ مسجد جوہر الّالہ کا نقشہ

کی زندگی بسر کرتے تھے۔
ان کے یہ صوفی عقائد
ایرانی الاصل تھے۔
خانقاہ بیبرس کا نقشہ
مدرسہ کے نقشہ سے لیا
گیا ہے۔ نماز کے لئے
صدر ایوان کو جہاں
تک ممکن تھا عریض
بنایا گیا ہے اور بغلی
ایوانوں کو چھوٹے چھوٹے
عبادت خانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان عبادت
خانوں میں وسطی صحن کی طرف سے چھوٹے دروازوں
کے ذریعہ داخلہ بنایا گیا ہے۔ پندرھویں صدی کی
مسجد جوہر الّالہ میں بھی بغلی ایوانون کے حجم اور ان
کی اہمیت اتنی گھٹا دی گئی ہے کہ وہ وسطی صحن سے
دور طاقوں سے بس کچھ ہی بڑھ کر ہیں۔ ان کے
دروازوں میں کمان کے ذریعہ فصل دیا گیا ہے۔ مدرسہ
قائت بائی کو غالباً مسجد قائت بائی کہنا زیادہ صحیح
ہوگا، اس کے ساتھ قائت بائی کا مقبرہ لگا ہوا ہے
یہ مدرسہ سنہ ۱۴۷۴ء میں مکمل ہوا ہے۔ اس کے صدر ایوان
کو نماز کے اغراض کے لئے زیادہ مکمل اور کامیاب طریقہ

پر اختیار کیا گیا ہے۔ مسجد جوہر اَلَالَہ میں ایوان کا عمق صحن کے برابر ہے۔ مسجد قائت بائی میں یہ قابل لحاظ حد تک کم ہے، لیکن ادھر ایوان کا عرض صحن سے کہیں زیادہ ہے (شکل ۵۵) مسجد قائت بائی میں ایوان کی مساحت عرض میں تیس فیٹ اور عمق میں تیئیس[۲۳] فیٹ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مدرسہ کے ایوان کو نماز کے لئے موزوں مقام میں تبدیل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کے طولی محور کو دیوار قبلہ سے زاویۂ قائمہ پر بنانے کی بجائے اس کے متوازی رکھا جائے۔ قوسی لداؤ چھت کی جگہ سپاٹ چوبی چھت کا استعمال ایک تعمیری نتیجہ ہے جو شکل اور محوری سمت کی تبدیلی کی وجہ سے ناگزیر ہوگئی ہے۔ کسی جگہ کو خواہ کسی قوسی لداؤ چھت سے یا سپاٹ چوبی چھت سے پاٹا جائے وہ سمت جس میں لداؤ چھت کی جبت ہوتی ہے یا وہ سمت جس میں کڑیاں لگائی جاتی ہیں وہ ہمیشہ سب سے چھوٹے فصل کی سمت ہوتی ہے۔ اصل مدرسہ میں سب سے چھوٹا فصل دیوار قبلہ کا متوازی ہوتا تھا، لیکن پندرھویں صدی میں نماز کے اغراض کے لئے تغیر و تبدل کئے ہوئے ایوان میں سب سے چھوٹا فصل دیوار قبلہ سے قائمہ زاویوں پر تھا۔ اس نے (دیکھئے شکل ۵۷) نتیجتہً اس کے مقابل کی کمان کے ساخت



شکل نمبر ۵۴- مسجد جوہرالدلہ کا صدر ایوان



شکل ۵۵ مسجد قائت بائی کا نقشہ

بغلی دیواروں کی جگہ لے لی۔ قوسی لداؤ چھت کو سہارنے کے لئے ایک مضبوط دیوار کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیوار قبلہ کو کافی مضبوط بنایا جا سکتا ہے، لیکن کمان کو ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد چوبی چھت ایک ناگزیر چیز ہو گئی۔ سنہ ۱۴۷۹ء کی بنی ہوئی مسجد ابوبکر مظہر میں ایوان کی بڑی کمان بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ تین کمانوں نے لے لی ہے۔ یہ کمانیں ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ دوسرا تصرف جو پندرھویں صدی میں عام ہو گیا، صحن پر چھت ڈالنا ہے۔ مسجدوں کا حجم کم ہو جانے کی وجہ سے یہ صورت ممکن ہو گئی تھی۔ مسجد کے ساتھ مقبرہ بنانا فاطمی دور کی ایجاد ہے۔ بعد کے دوروں میں بھی یہ طریقہ جاری رہا۔ جرکسی دور میں پتھر کا شاندار گنبد والا مقبرہ بعض اوقات اس مسجد یا مدرسہ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا جس کے ساتھ وہ بنایا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی کے دوران میں استر کی حیثیت سے کچھ اہم مذہبی عمارتوں سے غائب ہو جاتی ہے۔ سلطان برقوق کے مدرسہ

ہیں ــــــ یہ مقبرہ چودھویں صدی کے ربع آخر میں تعمیر ہوا ہے ـــــــ (مرمریں "وزارا" یا روکار کی سطح سے اوپر) ایوان کی دیواروں کی اندرونی سطحوں کو پاٹنے کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ لیکن مسجد جوہر اَلَلّٰہ میں جو اس کے چھتیس۳۶ سال بعد تعمیر ہوئی، گھڑے ہوئے پتھروں نے اس کی جگہ لے لی ہے (شکل ۵۴ء)۔ اندرونی کتبے جو چودھویں صدی میں گچ میں کاٹے گئے تھے۔ (مثلاً مدرسۂ سلطان حسین میں) وہ پندرھویں صدی میں پتھر میں کندہ کئے گئے اور دیواروں پر یا کمانوں کے پچروں پر کندہ بھروان کام کے گل بوٹوں نے ابتدائی زمانے کی استری زیبائش کی جگہ لے لی۔ تاہم رنگین شیشوں کے منبت کار دریچوں کے بنانے میں اب بھی استرکاری کا استعمال ہوتا تھا۔ اسے اس شکل میں جو عام طور پر گسو GESSO کہلاتی ہے تختوں اور چوبی شہتیروں کے ساتھ سریش لگے کھجور کے پتوں کے ریشوں کے ساتھ استعمال کی جاتی تھی، جہاں اسے دیواری نقوش کے نمونوں میں ڈھالا جاتا تھا۔ اور یہ چھت گیری کی رنگین آرائش کے لئے زمین فراہم کرتے تھے۔ آخر میں استر سنگی عمارتوں کے گچ مسالے کا سب سے اہم جزو ترکیبی ہوتا تھا۔

تعمیر کاری کے لحاظ سے مملوک دور سنہ ۱۴۷۲ء سے سنہ ۱۴۷۴ء کی بنی ہوئی قائت بائی کے مقبرہ مسجد

یا مدرسہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے نقشے کی اہم خصوصیتوں میں نماز کے لئے عریض الوان کا ذکر گذر چکا ہے۔ صحن کے گوشے میں ایک راستہ مقبرہ کی طرف نکلتا ہے۔ یہ مقبرہ ایک مربع کمرہ ہے۔ اس پر ایک شاندار سنگی گنبد بنایا گیا ہے، گنبد کو زیریں تعمیر کے گوشوں کے اوپر توڑے دار چنائی کے دوروں پر بنایا گیا ہے۔ اور اس کے پتھر کے سرے قلمی آرائش سے مزین ہیں۔ باب الداخلے کے بائیں جانب ایک سبیل ہے اور سبیل کے اوپر ایک کُتّاب ہے (شکل ۵۶)۔ داخلہ کو ایک سہ برگی کمان سے پاٹا گیا ہے۔ اس کے نچلے سرے پر قلمی آرائش ہے۔ لیکن قلمی آرائش کی اہمیت اس صورت میں کچھ گھٹ گئی ہے۔ مسجد آسان بوغا میں جو ایک صدی پہلے کی تعمیر ہے (سنہ ۱۳۷۰ء)، سہ برگی کمان کے بنا گوشوں کا زیریں حصّہ کچھ واضح نہیں۔ اور یہ تقریباً تمام تر قلمی آرائش میں گم ہوگیا ہے۔ قائت بائی کے شاندار باب الداخلہ میں زیریں حصّہ بالکل واضح ہے اور قلمی آرائش طاق کے گوشوں میں ہٹا دی گئی ہے۔ داخلے کی ڈیوڑھیوں میں قلمی آرائش کی یہ تقریباً آخری مثال ہے۔ اس کے استعمال کی آخری مثال سنہ ۱۴۷۵ء کی ہے۔ جزئیات میں ترقی کی قابل لحاظ چیز کمان

---

۵ قلاۃ الکبش، قاہرہ میں قائت بائی کی تعمیر کی ہوئی مسجد دیکھنے کے، اے سی، کریسول کی مختصر فہرست۔

کے اطراف کا حاشیہ ہے (جو مسجد آسان بوغا میں مسلسل چلا گیا ہے) اس میں یہاں وقفہ وقفہ سے چھوٹے چھوٹے روزن دئے گئے ہیں جو "میما" کہلاتے ہیں۔ یہ "میما" دو بیرونی مرغولوں کو جن سے حاشیہ بنتا ہے، گتھا کر ایک قاسم CAVITTO کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ پورا حاشیہ خود بھی افقاً سیدھے اور بائیں بڑھنے سے پہلے سہ برگی کمان کے اوپر ایک روزن بناتا ہے، اور پھر عموداً کمان کے پیروں کی طرف نیچے آتا ہے، یہاں پھر وہ ایک بار افقاً مڑ جاتا ہے اور اس طرح پورے سہ برگی سرے اور ایسے ہی عموداً اور افقاً آگے بڑھ کر محصورہ نمایاں کمان شانوں کے لئے ایک حائط چوکھٹا بناتا ہے۔ ان کے سرے پر ایک نفیس کشتی ہے جس پر ایک کتبہ کندہ کیا گیا ہے۔ یہ گرہ دار حاشیہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۴۴۱ء میں مسجد قراخواجہ الحسنی میں مینار کی بنیاد پر نمودار ہوا۔ؔ کمان کے سرے پر روزن اور بھی پرانی ایجاد ہے۔ یہ پہلی مرتبہ (لیکن استرکاری میں) جامع الجیوشی کے محراب کی کمان پر پایا جاتا ہے۔ دوسری مرتبہ یہ مقبرۂ قلاؤں میں پھر نمودار ہوتا ہے اور پھر (لیکن اس مرتبہ پتھر میں) سلطان حسین کے عظیم الشان مدرسہ کے شاندار باب الداخلہ کی بغلی محرابوں پر دکھائی دیتا ہے۔ ممکن

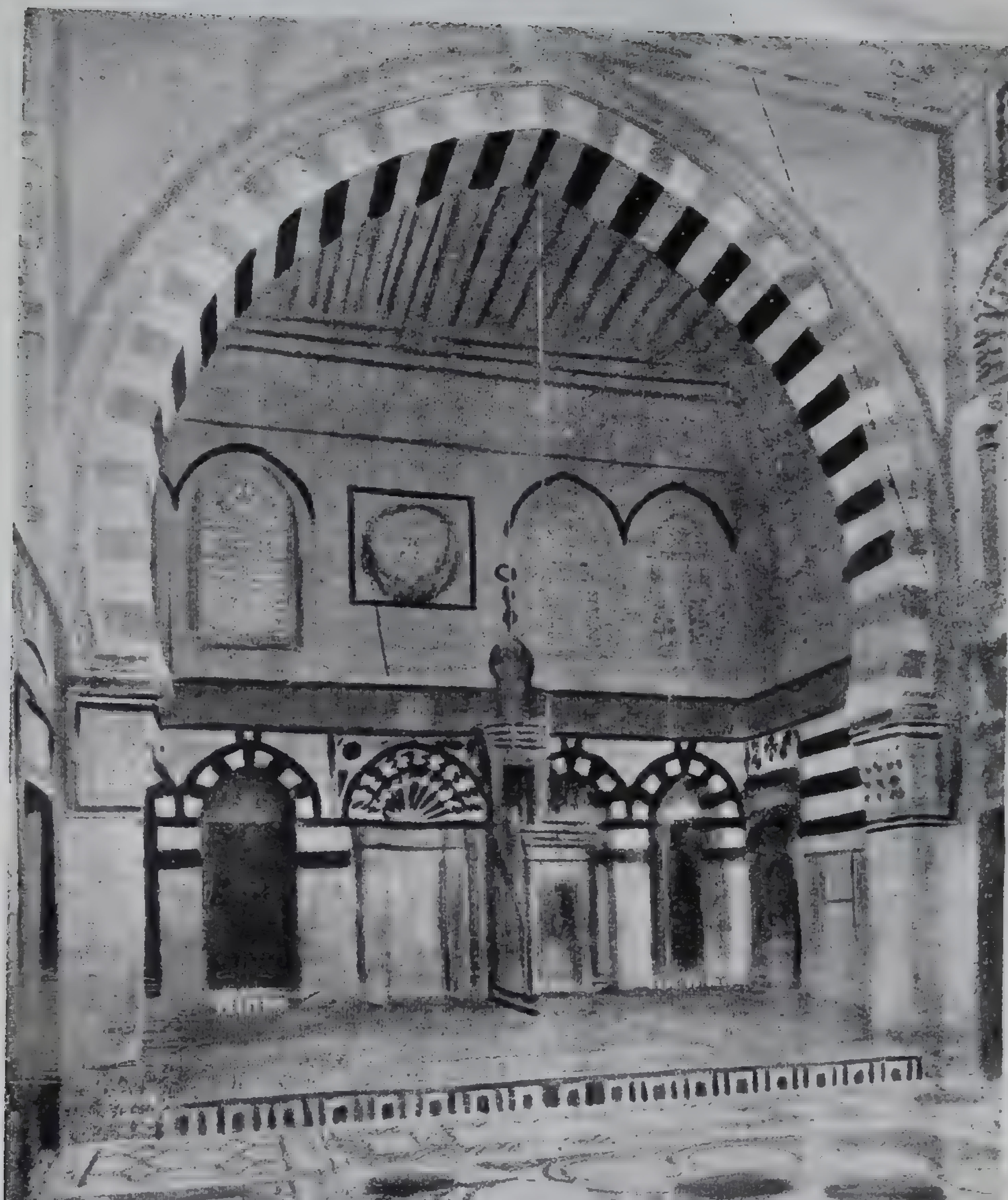
ؔ کرسول کی مختصر فہرست



شکل نمبر ٥٦- مسجد قائت بائی

ہے اس کی اصل ارمنی یا اناطولیائی ہو ۔ گرہ دار حاشیہ مینار
قائت بائی پر نہایت وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے۔
یہاں یہ مربع سے مثمن کی عبوری منزل کو نمایاں کرتا
ہے اور مثمنی منزل کے دریچوں کے باہر کے چھجے کو اٹھائے
ہوئے قلمی آرائش کے توڑوں کی درمیانی جگہ کے گرداگرد
چلا گیا ہے اور چھوٹی چھوٹی آرائشی دیواری کمانوں کے
سروں کے گرد بھی چلا جاتا ہے جو آٹھ رخوں کی زینت
ہیں۔ اسی طرح ان کمانوں کے اوپر وہ پٹی بھی تزئین کے
لئے استعمال کی گئی ہے جو مثمنی منزل کے سرے کو گھیرے
ہوئے ہے۔ یہ حاشیہ اندرونی جانب بھی زیریں تعمیر
کے مربع کے گنبد کے دائرہ میں عبور کے تمام عناصر
کے سوا تین روزن دار روشن دانوں اور ان کے
اوپر بنے ہوئے روشن دانوں کو نمایاں کرنے کے لئے
استعمال کیا گیا ہے۔ مینار کی مدور منزل اور گنبد کو
گتھے ہوئے ہندسی اور گل بوٹوں کے نمونوں سے
مزین کیا گیا ہے۔ اسلامی تعمیر کاری میں اس اصول
کی پہلی مثال چھ سو سال پہلے جامع ابن طولون میں
ملتی ہے۔ پیش رخوں کو سپاٹ طاقوں میں تقسیم کیا
گیا ہے۔ یہ طاق پایوں کے ذریعہ ایک دوسرے
سے الگ کئے گئے ہیں۔ طاقوں کے اندر دریچے
اسی طرز پر ترتیب دئے گئے ہیں جو صلیبی جنگوں

کے بعد عام طور پر اختیار کر لی گئی تھی۔ طاقوں کے سروں پر قلمی آرائش کی گئی ہے اور دیواروں پر گھڑ گچ چڑھائے گئے ہیں۔ انھیں یہاں "شرافت" کہا جاتا ہے۔ سبیل کے دریچوں میں نہایت مرصع دندانے دار سردلین چڑھائی گئی ہیں اور ان کے اوپر اتنی ہی مرصع خسی ڈاٹیں بنائی گئی ہیں۔ تعمیر کا یہ طریقہ وہ ہے جو پہلی مرتبہ فاطمی دور میں نمودار ہوا تھا۔ دریچے کا پورا سرا، سردل اور خسی ڈاٹ یہ سب "میما" یا گرہ دار حاشیے سے گھرے ہوئے ہیں۔ اندر کی طرف مختلف رنگوں کے فرش ہیں۔ ان کو ہندسی اشکال کے نمونوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ان نمونوں میں دائرہ کی شکل سب پر حاوی ہے۔ اور قدیم ستونوں کو افقاً کاٹ کر انھیں مدور فرشی سلون کے طور استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ دیوار قبلہ ان کمانوں کی سطح جست تک جو دریچوں کے موکھوں کو فصل دیتے ہیں، مرمر کے دلّوں اور مرمر کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی پچی کاری سے مزین کی گئی ہے محراب بھی مرمر اور پچی کاری سے مزین کی گئی تھی۔ محراب کے اوپر (شکل ۵۷) پتھر میں کٹا ہوا ایک نفیس کتبہ دیواروں کے اطراف جاتا ہے۔ چھت سپاٹ ہے اور کبھی مرصع "جسو" GESSO سے خوب ہی مزین تھا۔ دریچے استرکاری کی جالیوں کے ہیں۔ ان جالیوں



شکل نمبر ۵۷ مسجد قائت بائی کا صدر ایوان

میں رنگین شیشے جمائے گئے ہیں۔ ایک "میما" حاشیہ ایوان کی کمان کے گردا گرد جاتا ہے، اور اس کی چوٹی پر روزن بناتا ہوا افقاً دیوار صحن کے اطراف گھوم جاتا ہے۔ اس کے اوپر پتھر میں کندہ ایک دوسرا بڑا کتبہ ہے۔ صحن مشقف تھا۔ تمام سطحی کندہ کاری کی تزئین کے لئے سونا اور رنگ استعمال کئے گئے تھے۔ چوبی مہرہ بھی بہت رنگین تھا۔ بیرونی دروازے کانسی سے پاٹے گئے تھے اور اسے ہندسی نمونوں میں اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ وہ دِیّے بناتے تھے۔ اور ان دِیّوں کے اندر گل کاری بھی کانسی سے کی گئی تھی۔ اندرونی دروازے چوبی تھے۔ ان میں عرضاً دھات کی دو پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ صحن کے دروازوں کے اوپر متصل طاقیں ہیں۔ ان کے سر قلمی آرائش کے ہیں اور یہ ابتدائی استرکاری کی باقیات ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی میں نئے تصورات لانے والے صناعوں کی رو —— وہ رو جو گذشتہ صدیوں میں کئی نسلوں تک قاہرہ کی طرف چلتی رہی —— اب چلنی بند ہو گئی۔ وہ صناع جن کے خاندان مصر میں آباد ہو گئے تھے، وہ ظاہر ہے اتنے زیادہ تھے کہ قائت بائی کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل تک کے لئے کافی تھے۔ کسی دور میں تعمیر کاری کی اس سے

بڑھ کر ہماہمی قاہرہ میں نہ ہوئی تھی۔ پندرھویں صدی ان تصورات کا جو پچھلی صدیوں میں اس ملک میں در آمد ہوئے تھے ان کے جذب اور تنقیدی اخذ کا دور ہے۔ یہ ہر صنعت میں باریک بین نفاست کا عہد تھا۔ علم کیمیا کی ایک تشبیہہ سے اسے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ اب فن تعمیر واضح طور پر قابل تمیز عناصر کا آمیزہ نہیں رہا تھا، بلکہ یہ ایک ایسا مرکب بن چکا تھا جو اپنی مخصوص وضع، ساخت اور طرز رکھتا تھا اس کے تمام اجزاء ہم آہنگ اور سب ایک کل میں مرتب تھے۔ چودھویں صدی کے اختتام تک ملک کی تعمیر کاری کی تمام صنعتوں کے فنی علم سے کافی بہرہ یابی ہی پندرھویں صدی میں صناعوں کی قابل لحاظ تعداد کی آمد کو روک دینے کا باعث نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۴۲۶ء میں قبرس کی فتح کے سوا جس میں بادشاہ جیمس آف سگنان کو سلطان الاشرف برس بائی نے قید کر لیا، مصری سلطنت میں مزید اضافے نہیں ہوئے۔ اور نہ چرکسی مملوکوں کا دور حکومت ایسا تھا کہ غیر ملکوں سے لوگ جوق در جوق مصر چلے آتے۔ یہ ایک طاقت ور طبقے کی فوجی حکومت تھی۔ ان کے آپس کے جھگڑوں نے چرکسیوں میں افتراق پھیلا رکھا تھا[۵] جعلی سکہ چلتا

---

[۵] کرسول کی مختصر فہرست۔ اسٹینلی لین پول، محولہ صدر کتاب۔

تھا۔ زبردست محاصل عائد کئے گئے تھے۔ جان و مال محفوظ نہ تھے۔ لڑائیوں میں جبری بھرتی ہوتی تھی۔ حکومت میں انتشار اور لامرکزیت پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی طاعون اور قحط کی بلائیں بھی نازل ہو جاتی تھیں۔ اور لغاوتیں تو کثرت سے ہوتی تھیں۔ لیکن سرکشی، خانہ جنگی، اور بدعنوانی کے باوجود بھی چرکسی سلاطین نے شام میں تیمور جیسے فاتح کے حملوں کا مقابلہ کیا اور شمالی سرحد پر ترکمان ریاستوں کے مقابلہ میں دو مہمیں کامیابی کے ساتھ سر کیں ؎۔ انھوں نے ہندوستانی تجارت کو فروغ دیا اور محاصل عائد کر کے خوب ہی نفع کمایا۔ انھوں نے شکر، سونٹھ، چوبینہ، اور دہاتی صنعت کو سرکاری اجارہ قرار دیا۔ ان کے دور میں خانگی تجارت کے لئے حالات اتنے بُرے ہو گئے تھے کہ اہل وینس نے اپنے تاجروں کو منتقل کر لینے کی دھمکی دی تھی۔ اور اسپینی بادشاہوں نے مصری جہازوں پر حملہ کرنے کے لئے اپنی جنگی جہاز روانہ کئے تھے۔ سنہ ۱۴۵۳ء میں عثمان لی ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تھا۔ یہی ترک قائت بائی کے عہد حکومت میں مصری سلطنت کی سرحد پر قوت کے ساتھ نمودار ہوئے۔ سنہ ۱۴۹۷ء میں واسکوڈی گاما نے راس امید کا چکر کاٹا اور وہ تجارت جس نے مملوکوں کو اتنا امیر بنا دیا

؎۔ اسٹینلی لین پول، محولہ صدر کتاب۔

تھا۔۔۔ اتنا امیر کہ وہ ایک نہایت بری طرح زیر فرمان ملک میں شاندار تعمیری یادگاریں بنا سکے۔۔۔ سمندر کے راستے یورپ کا رُخ کیا۔ بحیرہ احمر میں تجارت کرنے والے جہازوں کو پرتگالیوں نے پکڑ لیا، اور سنہ ۱۵۱۲ء میں ہندوستانی تجارت کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ سنہ ۱۵۱۲ء میں البوکرک نے عدن پر حملہ کر دیا اور اسی حملہ نے ہندوستانی تجارت کا پانسہ پلٹ دیا۔ سنہ ۱۵۱۴ء میں ترکی کے عثمان لی سلطان سلیم اول نے ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد شام اور مصر میں مملوک حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ دو سال بعد ۲۴ اگست سنہ ۱۵۱۶ء کو حلب کے شمال میں عثمان لی ترکوں اور مملوکوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اسی سال کی ابتداء میں سلیم قاہرہ میں داخل ہوا۔ اور صدیوں سے ایک سلطنت کا دارالحکومت رہنے کے بعد قاہرہ ایک صوبائی شہر بن کر رہ گیا۔

تعمیر کاروں، صناعوں، معماروں، آہن گروں تجاروں، مرمر کا کام کرنے والوں، سنگ سازوں فرش سازوں، خرادیوں اور دوسرے صناعوں کی ایک بڑی تعداد ان کے بال بچوں کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دی گئی۔ اور ایک عرب مصنف کے بیان کے مطابق[۵]

۵۔ ابن ایاس، ج ۲، ص ۱۴۹

یہ سب کے سب اپنا وطن چھوڑنے پر بہت ہی گریان و نالان تھے۔ ہمیں یہ خیال کرنے کی اجازت دی جائے گی کہ ان میں سے کم سے کم بعض نے اس حقیقت کو تسلیم کرکے کچھ سکون پایا ہوگا کہ اب زمانہ بدل چکا، اور تجارت کہیں اور جا چکی۔ اگر وہ مصر میں رہ گئے ہوتے تو اب بس بے روزگاری، افلاس اور ممکن ہے فاقہ کشی ہی ان کا یہاں ساتھ دے سکتی۔ ترک بھی شاید خیرات مبرات سے کام نہ لیتے۔ ان واقعات کے ساتھ، مملوک عہد جو اسلامی فن تعمیر کا سب سے درخشاں عہد ہے، اختتام کو پہنچتا ہے۔

انجمن کی نئی کتابیں

پرچھائیں :- آصف علی صاحب گورنر اڑلیسہ کے قلم کا ایک شاہکار، فلسفہ حیات اور اس کے حقایق شاعرانہ تخیل کے پردے میں اعلیٰ قسم کا کاغذ بہترین ٹائپ کی طباعت۔ قیمت چار روپیہ

مشترکہ زبان راشٹر بھاشا کے سوال پر مہاتما گاندھی کے خیالات جو اس وقت نظر انداز کئے جا رہے ہیں ٹائپ کی اعلیٰ طباعت - مرتبہ انجمن ترقی اردو۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے

یادگار حالی بیگم صالحہ عابد حسین کی مرتب کی ہوئی سوانح عمری جس میں حضرت حالی کی سیرت اور ان کی شاعری کے دلنواز پہلو واضح کئے گئے ہیں۔ طباعت لیتھو۔ قیمت چار روپیہ چار آنے

حیات سر سیّد مرتبہ مولوی نور الرحمٰن - سر سید کی زندگی پر ایک مختصر مگر جامع تبصرہ ہے۔ طباعت لیتھو۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے

حیات اجمل مرتبہ قاضی عبد الغفار صاحب حکیم اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات جس میں مسیح الملک کے کردار کو ان کے زمانہ کی سیاسی تاریخ کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے اس کتاب کا مخصوص پہلو یہ ہے کہ وہ سوانح عمری بھی ہے اور اس زمانہ کی سیاسی تاریخ بھی جبکہ حکیم صاحب مرحوم قومی لیڈروں کی صف اول میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ طباعت لیتھو۔ قیمت آٹھ روپیہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ